مرتبہ: سید محمد اصغر کاظمی

علامہ نیاز فتح پوری

ایک کثیر الجہات شخصیت

مرتّبہ

سیّد محمد اصغر کاظمی

Near Regal Chowk,
19 - Temple Road, Lahore.
www.alwaqarpublications.com
alwaqarpublications@gmail.com

فہرست

عرضِ مرتب

علامہ نیاز فتح پوری ایک کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے اُردو نثر میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں حق کو فروغ دیا اور فرسودہ روایات کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ مذاہب عالم پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ ان کا اسلوب نگارش بھی جداگانہ تھا۔ ان کی تحریروں میں سکون بھی ہے اور اضطراب بھی ہے جلال بھی، اور جمال بھی۔ ان کی تحریریں خواہ ادبی نوعیت کی ہوں، یا صحافتی وہ سب اعلیٰ معیار رکھتی ہیں۔ افسانہ نگاری اور ناول نویسی کے حوالے سے ان کی شہرت اور مقبولیت کا آغاز ہوا۔ وہ ایک عمدہ انشاءپرداز اور ایک ذہین تنقید نگار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان کی تنقید نگاری میں مصلحت اندیشی کی چھاپ کے بجائے بیباکی کا رنگ گہرا اور نمایاں ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں علامہ نیاز کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر ممتاز و معروف اہلِ قلم نے روشنی ڈالی ہے۔ اُمید ہے اہلِ نظر اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

مرتب

سید محمد اصغر کاظمی

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

نیاز فتح پوری ایک نظر میں

۱۔ نام، وطن اور تاریخ پیدائش

۱۔ پیدائشی نام۔ نیاز محمد خاں (والدہ کا رکھا ہوا)

۲۔ تاریخی نام۔ لیاقت علی خاں (والد کا رکھا ہوا)

۳۔ قلمی نام۔ نیاز فتح پوری

۴۔ باپ کا نام محمد امیر خاں متوفی سنہ ۱۹۰۸ء

۵۔ وطن۔ فتح پور ہسوہ محلہ خیلدار

۶۔ جائے پیدائش۔ سنی گھاٹ (ضلع بارہ بنکی)

۷۔ تاریخ پیدائش سنہ ۱۳۰۳ھ سنہ ۱۸۸۴ء

۸۔ خطاب۔ پدما بھوشن۔ اپریل سنہ ۶۲ء میں منجانب حکومتِ ہند

۹۔ وفات کراچی ۲۴ مئی سنہ ۱۹۶۶ء

۲۔ تعلیم و تربیت

۱۔ چھ سات سال کی عمر تک گھر پر مکتبی تعلیم والد کی زیرِ نگرانی پائی۔ پہلے مولوی حبیب الدین صاحب (ساکن نیوتنی ضلع اناؤ) شاگرد مولانا احسن بگرامی اور بعد ازاں لکھنو میں مولوی صدیق حسن غازی پوری اتالیق مقرر ہوئے۔

۲۔ نو دس سال کی عمر میں مولانا ظہور الاسلام کے بنا کردہ مدرسہ اسلامیہ فتح پور

سوانحی مضامین تقریباً	۱۵۰	معلوماتی مضامین تقریباً	۵۰۰
تبصرے تقریباً	۳,۰۰۰	استفسارات کے جوابات "	۲۵۰
اردو نظمیں "	۹	اردو غزلیں تقریباً	۱۵
فارسی نظمیں اور غزلیں تقریباً	۱۵	افسانے تقریباً	۱۵۰
ڈرامے تقریباً	۷		

۲۴۔ نیاز کے سلسلے میں تحقیقی و تنقیدی کام

۱۔ برِعظیم پاک و ہند کے مختلف جامعات میں پی، ایچ، ڈی کی سطح کا کام ہو چکا ہے لیکن مطبوعہ صورت میں صرف ڈاکٹر امیر عارفی صاحب کا مقالہ، انجمن ترقی اردو ہند کی معرفت منظرِ عام پر آیا ہے۔

۲۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے شعبۂ اردو سے منسلک ڈاکٹر عقیلہ شاہین صاحبہ نے جامعہ کراچی سے ۱۹۸۶ء میں "نیاز فتح پوری، احوال و آثار" کے زیرِ عنوان تحقیقی کام کر کے پی۔ ایچ، ڈی کی سند لی ہے۔ مقالہ انجمن ترقی اردو کراچی سے شائع ہو چکا ہے

۲۵۔ نیاز سے متعلق رسائل کے خاص نمبر

۱۔ ۱۹۵۲ء میں حضرت رئیس امروہوی نے ہفت روزہ "شیراز"، کراچی کا نیاز نمبر شائع کیا۔

۲۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں عائشہ خالد نے نیاز کی نثری تحریروں کا انتخاب کیا اور اُن کے مفصل مقدمے کے ساتھ نگار کا "انشائے لطیف" نمبر شائع ہوا۔

۳۔ سنہ ۱۹۶۳ء میں راقم الحروف نے دو ضخیم جلدوں میں نگار کا نیاز نمبر شائع کیا۔ اس میں پاک و ہند کے سارے معتبر اہلِ قلم نے حصہ لیا اور خود نیاز فتح پوری نے بطور خود نوشت ایک طویل مقالہ قلم بند کیا۔

۵- اولاد

۱- پہلی بیوی سے چار لڑکیاں ہوئیں۔
۲- دوسری بیوی مختار بیگم سے صرف شوکت جہاں آرا ہوئیں جو لکھنؤ میں محمد ذکو بیاہی تھیں اور ۱۹۵۴ء میں وفات پاگئیں۔
۳- تیسری بیوی گلزار بیگم نیاز صاحب کی چھوٹی سالی تھیں پہلے ظفر احمد خاں کو بیاہی تھیں جن سے محمد یوسف خاں، محمد آصف خاں، محمد عارف خاں اور محمد قمر خاں اور ایک بیٹی ہوئی۔ بیوہ ہوجانے کے بعد نیاز صاحب کے نکاح میں آئیں اور ان سے دو لڑکے محمد سرفراز خاں نیازی اور محمد ریاض خاں نیازی پیدا ہوئے۔ ان کی عمریں اس وقت بالترتیب ۲۸، ۲۶ سال ہیں اور دونوں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور اپنے اپنے شعبۂ علمی میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔

۶- خاندان

۱- محمد امیر خاں نے تین شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے ایک لڑکی ہوئی۔ دوسری بیوی سے محمد نجابت علی خاں پیدا ہوئے جن کا ۱۲-۱۳ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ تیسری بیوی سے ایک لڑکی نظیر النساء اور نیاز محمد خاں پیدا ہوئے۔

۷- قابلِ ذکر ہم درس فتح پور میں

۱- مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی
۲- سید روح الحسن (برادرِ بزرگ مولانا حسرت موہانی)
۳- سید مشتاق حسین، فتح پوری۔

۸- طویل قیام

سنِ پیدائش ۱۸۸۴ء سے لے کر ۱۹۱۴ء تک کے درمیانی حصے میں تقریباً اکیس

میں داخل ہوئے۔ علوم اسلامی کے ساتھ ساتھ یہیں سے ۱۸۹۸ء میں انگریزی مڈل اور ۱۸۹۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

۲۔ اس سے پہلے تقریباً ڈیڑھ سال دار العلوم ندوہ لکھنؤ میں رہے پھر مدرسہ عالیہ رام پور میں داخل ہوئے جس کے پرنسپل مولانا عرب طیب صاحب علم و فضل کے اعتبار سے اس زمانے کے نہایت ممتاز شخصیت خیال کیے جاتے تھے یہاں مولانا وزیر محمد خاں شاگرد مولانا عبدالحق خیر آبادی تعلیم حاصل کی۔

۳۔ قابلِ ذکر اساتذہ جن کا مثبت یا منفی اثر قبول کیا

۱۔ مولانا سید ظہور الاسلام صاحب محرک ندوۃ العلماء بانی مدرسہ اسلامیہ فتح پور

۲۔ مولانا نور محمد صاحب مدرس اعلیٰ شاخ عربی مدرسہ اسلامیہ فتح پور

۳۔ مولانا فاروق چریا کوٹی

۴۔ مولانا عرب محمد طیب صاحب مدرس اعلیٰ مدرسہ عالیہ رام پور

۵۔ مولانا وزیر محمد خاں مدرس عالیہ رام پور

۶۔ مولانا محمد حسین خاں فاضل دیوبند مدرس مدرسہ اسلامیہ فتح پور

۷۔ مولوی اعزاز علی صاحب ہیڈ ماسٹر شاخ انگریزی مدرسہ اسلامیہ فتح پور

۸۔ مولوی حبیب الدین اتالیق و مدرس مدرسہ اسلامیہ فتح پور

۹۔ مولوی صدیق حسن غازی پوری اتالیق

۴۔ شادی

۱۔ پہلی شادی ۱۹۰۱ء میں بعمر سترہ سال الہ آباد میں ہوئی۔ ۱۹۲۳ء میں بیوی کا انتقال ہو گیا۔

۲۔ دوسری شادی ۱۹۲۴ء میں بمقام لکھنؤ مختار بیگم سے ہوئی جن کی وفات ۱۹۴۱ء میں ہوئی۔

۳۔ تیسری شادی ۱۹۴۲ء میں مرحومہ کی چھوٹی بیوہ بہن گلزار بیگم بنت محمد ولایت خاں سے لکھنؤ میں ہوئی۔

ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں مستعفی ہو گئے۔

۳۔ سنہ ۱۹۰۳ء اور سنہ ۱۹۰۵ء کے درمیان مدرسہ اسلامیہ انگریزی شاخ کے ہیڈ ماسٹر رہے۔

۴۔ سنہ ۱۹۰۶ء اور سنہ ۱۹۰۷ء کے درمیان بادلی اسٹیٹ (کدورا) میں بعہد نواب ریاض الحسن خاں، ہیڈ ماسٹر، شہر کوتوال اور پرائیویٹ سیکرٹری کے عہدوں پر مامور رہے۔

۵۔ سنہ ۱۹۰۵ء اور سنہ ۱۹۰۸ء کے درمیان اجے گڑھ اسٹیٹ بندیلکھنڈ میں پولیس سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔

۶۔ سنہ ۱۹۰۸ء اور سنہ ۱۹۰۹ء کے درمیان ہانسی (ضلع حصار) گئے اور وہاں اسکنر اسٹیٹ میں بحیثیت سیکرٹری کام کرنے لگے۔ سجاد حیدر یلدرم سے ملاقات ہونے اور ان کی تحریروں سے متاثر ہونے کا یہی زمانہ ہے۔

۷۔ سنہ ۱۹۰۹-۱۰ء میں واپس آکر دوبارہ مدرسۂ اسلامیہ سے منسلک ہو گئے۔

۸۔ سنہ ۱۹۱۰ء ہی کے درمیان چند ماہ مولانا ظفر علی خاں کے اخبار زمیندار سے منسلک رہے۔ مولوی وحید الدین سلیم بھی ان کے ساتھ تھے۔

۹۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں دوبارہ ہانسی (ضلع حصار) گئے اور میونسپل سیکرٹری مقرر ہوئے۔

۱۰۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں فتح پور واپس ہوئے اور مدرسۂ اسلامیہ سے منسلک ہو گئے۔

۱۱۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں دلی گئے اور حکیم اجمل خاں کے انگریزی اسکول کے نگراں رہے۔

۱۲۔ سنہ ۱۹۱۵ء میں بھوپال پہنچے اور مختلف شعبوں میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔

۱۱۔ صحافتی زندگی

۱۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں "زمیندار" اخبار سے منسلک رہے۔

۲۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں ہفتہ وار "توحید" کے معاون مدیر ہوئے۔

۳۔ سنہ ۱۹۱۲-۱۳ء میں ہفتہ وار "خطیب" کے قلمی معاون رہے۔

۴۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں روزنامہ اخبار "رعیت" کے چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

بائیس سال فتح پور میں بسر ہوئے۔ چونکہ نیاز صاحب کے والد محکمہ پولیس سے وابستہ تھے اور ان کا تبادلہ یوپی کے مختلف اضلاع میں ہوا کرتا تھا اس لیے نیاز صاحب کا قیام بھی مختلف شہروں میں رہتا تھا لیکن سال کے چند مہینے فتح پور ہی میں گذرتے تھے۔ ۹۴-۱۸۹۳ء کے قریب وہ مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں داخل ہوئے۔ اس وقت ان کے والد اگرچہ لکھنؤ میں تھے لیکن نیاز کا زیادہ قیام بغرض تعلیم فتح پور ہی میں رہتا تھا۔ ۹۷-۱۸۹۶ء میں جب ان کے والد نے پنشن لے کر رام پور میں وکالت شروع کی تو نیاز بھی رام پور چلے گئے۔ واپس آکر ۱۸۹۸ء اور ۱۸۹۹ء میں انھوں نے انگریزی مڈل اور میٹرک کے امتحان پاس کیے۔ اس کے بعد ملازمت کا سلسلہ رہا ۱۹۱۵ء تک یعنی بھوپال جانے سے پہلے وہ مختلف جگہ رہے۔ لیکن اس عرصے میں بھی انھوں نے مدرسہ اسلامیہ (انگریزی شاخ) کے نگراں کی حیثیت سے مختلف اوقات میں تقریباً پانچ چھ سال فتح پور میں قیام کیا۔

۲۔ بھوپال ۱۹۱۵ء سے ۱۹۶۲ء تک

۳۔ لکھنؤ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۶۲ء تک

۴۔ کراچی ۲۱ جولائی ۱۹۶۲ء سے تاحیات

۹۔ عہدِ رنگین کے یادگار مقامات

۱۔ مسوری ۲۔ کلکتہ ۳۔ الہ آباد ۴۔ دلی ۵ سری نگر ۶، ہانسی ۷، اچھے گڑھ ۸۔ لکھنؤ ۹۔ رام پور ۱۰۔ بھوپال ۱۱۔ بمبئی۔

۱۰۔ سلسلۂ ملازمت

۱۔ ۱۹۰۰ء میں پولیس سب انسپکٹر کے لیے نامزد ہوئے اور مرادآباد میں پولیس ٹریننگ مکمل کی۔

۲۔ ۱۹۰۱ء میں بہ حیثیت سب انسپکٹر تھانہ ہنڈیا (ضلع الٰہ آباد) میں تعینات

۱۴۔ نگار کا اجراء

۱۔ آگرہ — فروری ۱۹۲۲ء سے دسمبر ۱۹۲۲ء تک

۲۔ بھوپال — جنوری ۱۹۲۳ء سے جون ۱۹۲۷ء تک

۳۔ لکھنؤ — جولائی ۱۹۲۷ء سے جولائی ۱۹۶۲ء تک

۴۔ کراچی — اگست ۱۹۶۲ء سے اب تک جاری ہے

۱۵۔ فکر و فن کو متاثر کرنے والی شخصیتیں

۱۔ سر سید احمد خاں ۲۔ محسن الملک ۳۔ مولانا شبلی ۴۔ اکبر الٰہ آبادی ۵۔ ٹیگور ۶۔ آسکر وائلڈ ۷۔ مہدی افادی ۸۔ مولانا ظفر علی خاں ۹۔ ولیم ہیزلیٹ ۱۰۔ میر ناصر علی ۱۱۔ سرور جہان آبادی ۱۲۔ علامہ اقبال ۱۳۔ سید سجاد حیدر یلدرم ۱۴۔ مولوی کرامت حسین ۱۵۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۱۶۔ ورڈز ورتھ ۱۷۔ شیلی ۱۸۔ چسٹرٹن ۱۹۔ برنارڈ شا ۲۰۔ واشنگٹن ارونگ

۱۶۔ زبانوں سے واقفیت

۱۔ اردو ۲۔ فارسی ۳۔ عربی ۴۔ ترکی ۵۔ ہندی ۶۔ انگریزی

۱۷۔ علوم و فنون پر دسترس

۱۔ فقہ ۲۔ حدیث ۳۔ تفسیر ۴۔ نجوم ۵۔ علم الکلام ۶۔ معانی و بیان ۷۔ فلسفہ ۸۔ منطق ۹۔ عروض ۱۰۔ موسیقی ۱۱۔ تاریخ ۱۲۔ نفسیات ۱۳۔ قواعد ۱۴۔ فن تجوید ۱۵۔ فنِ انشاء ۱۶۔ تصویر کشی۔

۱۸۔ اردو کے پسندیدہ فنکار

انشائے لطیف ۱۔ مہدی افادی ۲۔ سجاد حیدر یلدرم ۳۔ میر ناصر علی

۵۔ سنہ ۱۲-۱۹۱۱ء میں "سہیل" نامی رسالہ نکالنے کا خیال ہوا لیکن اجراء نہ ہو سکا۔
۶۔ فروری سنہ ۱۹۲۲ء سے تا دمِ حیات یعنی مئی ۱۹۶۶ء تک مدیرِ اعلیٰ رہے۔

۱۲۔ علمی و ادبی زندگی

۱۔ فتح پور کے دورِ تعلیم ہی میں یعنی سنہ ۱۸۹۸ء اور سنہ ۱۹۰۰ء کے درمیان شعر و ادب کا ذوق پیدا ہو گیا تھا اور طرح پر غزل کہہ کر مشاعروں میں پڑھنے لگے تھے۔
۲۔ غزل کے ساتھ ساتھ نظموں کا شوق ہوا۔ چند دنوں انشائے لطیف اور رومانی افسانہ نگاری پر بھی قابو پالیا۔ یہ سلسلہ سنہ ۰۷-۱۹۰۶ء سے لیکر سنہ ۱۹۲۱ء تک برابر قائم رہا۔
۳۔ سنہ ۱۹۲۲ء کے بعد علمی اور مذہبی فکر انگیز تحریروں کا سلسلہ شروع ہوا۔
۴۔ سنہ ۲۶-۱۹۲۵ء سے تحقیقی و تنقیدی مقالات لکھنے کا آغاز ہوا۔
۵۔ سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد (متنوع مسائلِ حیات) اور مختلف علوم و فنون پر قلم اٹھایا اور نگار کو دائرۃ المعارف خیال کیا جانے لگا۔
۶۔ تخلیقات کی طباعت و اشاعت کا آغاز "انتخاب لاجواب" (لاہور) اور صلائے عام (دہلی) سے ہوا۔

۱۳۔ نگار سے قبل کی تحریریں

سنہ ۱۹۲۲ء یعنی نگار کے اجراء سے پہلے نیاز صاحب کی تحریریں زیادہ تر مندرجہ ذیل پرچوں میں شائع ہوئی ہیں۔

۱۔ انتخاب لاجواب (لاہور) (۲) صلائے عام (دہلی)
۳۔ زمیندار (لاہور) (۴) صوفی (امرتسر)
۵۔ رعیت (میرٹھ) (۶) خطیب (دہلی)
۷۔ الہلال (کلکتہ) (۸) تمدن (دہلی)
۹۔ نقاد (آگرہ)

۲۱۔ تصنیفی و تالیفی سرمایہ

مطبوعہ کتابیں ۱۔ ایک شاعر کا انجام ۲۔ جذبات بھاشا ۳۔ صحابیات، ۴۔ تاریخ الدولتین ۵۔ المسلۃ الشرقیہ (عربی سے ترجمہ) ۶۔ عرضِ نغمہ (ترجمہ گیتانجلی) ۷۔ فلاسفۂ قدیم کی روحوں کا اجتماع ۸۔ فراست الید ۹۔ مکتوباتِ نیاز، جلد اول ۱۰۔ مکتوباتِ نیاز جلد دوم ۱۱۔ مکتوباتِ نیاز جلد سوم ۱۲۔ مذاکراتِ نیاز ۱۳۔ نگارستان ۱۴۔ جمالستان ۱۵۔ ترغیباتِ جنسی ۱۶۔ شہاب کی سرگزشت ۱۷۔ مجموعۂ استفسارات و جوابات حصہ اول ۱۸۔ مجموعۂ استفسارات و جوابات حصہ دوم ۱۹۔ 〃 〃 〃 〃 سوم ۲۰۔ من و یزداں ۲۱۔ نقاب اٹھ جانے کے بعد ۲۲۔ گہوارۂ تمدن ۲۳۔ انتقادیات جلد اول ۲۴۔ انتقادیات جلد دوم ۲۵۔ مذہب ۲۶۔ جن کی عیاریاں ۲۷۔ مالہ وماعلیہ ۲۸۔ نقش ہائے رنگا رنگ ۲۹۔ مشکلاتِ غالب ۳۰۔ محمد بن قاسم سے بابر تک ۳۱۔ مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ ۳۲۔ تاریخ کے گم شدہ اوراق ۳۳۔ شبستان کا قطرۂ گوہریں ۳۴۔ من و یزداں حصہ دوم۔

۲۲۔ نیاز کے تحریر کردہ نگار کے خاص نمبر

۱۔ ملاحظات نمبر جنوری ۱۹۳۶ء ۲۔ ڈرامہ اصحاب کہف نمبر جنوری ۱۹۳۷ء ۳۔ قرآن نمبر جنوری ۱۹۴۵ء ۴۔ پاکستان نمبر جنوری ۱۹۴۶ء ۵۔ ایک مستقبل کی تلاش نمبر (نصف حصہ) جنوری ۱۹۵۱ء ۶۔ فرماں روایانِ اسلام نمبر جنوری ۱۹۴۲ء ۷۔ علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر جنوری ۱۹۵۵ء ۸۔ معلومات نمبر جنوری ۱۹۵۶ء ۹۔ تنقیحِ اسلام نمبر جنوری ۱۹۵۹ء ۱۰۔ غالب نمبر جنوری ۱۹۵۲ء

۲۳۔ نگار میں نیاز کی مطبوعہ تحریریں

ملاحظات (از اداریہ) تقریباً ۵۰۰ علمی و ادبی مقالات تقریباً ۷۰۰

ناول وافسانہ :۔ ۱۔ نذیر احمد ۲۔ شررؔ، سرشار، راشد الخیری، پریم چند

طنزو مزاح :۔ ۱۔ اکبر الہ آبادی ۲۔ پطرس بخاری ۳۔ رشید احمد صدیقی ۴۔ شوکت تھانوی

نظم نگاری :۔ ۱۔ اسمٰعیل میرٹھی ۲۔ سرور جہان آبادی ۳۔ اقبال ۴۔ اختر شیرانی ۵۔ حفیظ جالندھری ۶۔ نظیر اکبرآبادی ۷۔ جمیل مظہری ۸۔ جوش ملیح آبادی ۹۔ شوق قدوائی ۱۰۔ منظور حسین شور

گیت اور غزل :۔ میر، مصحفی، غالب، مومن، داغ، فانی، جلال لکھنوی، شاد عظیم آبادی، حفیظ جالندھری، فراق گورکھپوری، حسرت موہانی، وحشت کلکتوی فیض احمد فیض، اجتبیٰ رضوی، علی اختر حیدر آبادی۔

مثنوی :۔ میر حسن، شوق قدوائیؔ، نواب مرزا شوق

مرثیہ :۔ میر انیس۔

۱۹۔ دوسری زبانوں کے پسندیدہ شعراء وادباء

۱۔ ترکی :۔ نگار بنتِ عثمان

۲۔ عربی :۔ ابو نواس۔ مہلہل، فرزدق، لیلیٰ اخیلیہ، ابوالعتاہیہ، متنبی۔

۳۔ فارسی : عرفی، غالب، فردوسی، سعدی، حافظ، خسرو، بیدل، ظہوری، اقبال نسبتی تھانیسری

۴۔ ہندی :۔ میرا بائی، بہاری لال، تلسی داس، عبدالرحیم خان خاناں۔

۵۔ انگریزی :۔ ولیم ہزلیٹ، ورڈسورتھ، شیلی، کیٹس، آسکر وائلڈ، واشنگٹن ارونگ رینالڈز، برنارڈ شا

۲۰ فرصت کے مشغلے

۱۔ مطالعۂ کتب ۲۔ موسیقی ۳ فوٹوگرافی ۴۔ میکانزم ۵۔ سیر و سیاحت

پروفیسر سجاد باقر رضوی

نیاز فتح پوری کی تنقید

کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں وائی۔ ایم۔ سی۔ اے لاہور کی عمارت کے بالائی حصے میں حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس ہوتے تھے اور نچلی منزل پر حلقہ ارباب علم کے۔ مولانا چراغ حسن حسرت (مرحوم) نے فقرہ لگایا کہ ذوق والوں کے پاس علم کی کمی ہے اور علم والوں کے پاس ذوق کی۔ حسرت صاحب کا فقرہ اپنی جگہ تاہم یہ حقیقت ہے کہ علم اور ذوق کی یکجائی قدرت کا کرشمہ ہوتی ہے۔ نیاز فتح پوری کی تنقید عالمانہ شکوہ اور اعلیٰ ذوق شعر کی مظہر ہے۔ ان کا اعلیٰ ذوق شعر جو کبھی بلند پایہ منظومات کی صورت میں اظہار پاتا تھا بالآخر ان کے علم کے ساتھ مدغم ہو کر تنقید کی صورت میں ظاہر ہوا۔ عربی، فارسی، ہندی اور اردو زبانوں میں مہارت اور انگریزی زبان سے مناسب واقفیت نے ان کے علم میں وسعت اور ذوق میں گہرائی پیدا کی تھی۔ ان کے تنقیدی مضامین کی نثر اعلیٰ سنجیدگی، وضاحت اور ذوقی تجزیہ کے باعث وقعت کی حامل ہے۔ اردو شاعری اور اردو غزل کے ارتقا پر ان کے مضامین اور مختلف شاعروں پر ان کے محاکمے ان کی تنقیدی بصیرت پر دلالت کرتے ہیں۔

اردو ادب کی تاریخ میں نیاز فتح پوری کا مقام متعین ہو چکا ہے۔ ان کا تعلق اردو ادب کے اس دبستان سے ہے جسے ہم رومانی، جمالیاتی اور تاثراتی دبستان کے نام سے جانتے ہیں۔ اس دبستان کو مقصدیت، افادہ و اصلاح والے دبستان کی نفی کہہ لیجئے۔ اردو تنقید کی ابتدا ہی اصلاحی مقاصد کے تحت ہوئی محمد حسین آزاد اور مولانا حالی دونوں ہی شاعری کی اصلاح چاہتے تھے۔ آزاد کی نظری تنقید ان دو خطبات میں ملتی ہے جو ۱۸۶۷ء اور ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب میں دیئے گئے اور جو نظم آزاد میں شامل

ہیں۔ آزاد کے یہ تنقیدی خطبات ذوقی و تاثراتی تنقید کی ذیل میں آتے ہیں۔ اس کے برخلاف مولانا حالی کی تنقید اعلیٰ تجزیاتی قوت کی مظہر ہے۔ انھوں نے ادب کو زندگی کے تابع کرتے ہوئے اسے اصلاحی منصب پر فائز کیا۔ اس کے ساتھ ہی ادب پر محاکے کے لیے اخلاقی نقطہ نظر کو رائج کیا۔ آزاد اپنے شعری تصورات کے ساتھ تنہا رہ گئے۔ حالی کے پیچھے سرسید کی تحریک تھی اور اردو شاعری میں وہی چلن رائج ہوا جس کی داغ بیل حالی نے ڈالی تھی۔ شبلی اور شرر کی تنقید میں گریز کی صورت نظر آتی ہے لیکن اخلاقیات کے شکنجے سے دونوں نہ بچ سکے۔

اخلاقیات اور جمالیات کے متعلق بات ہو رہی ہے تو اس ضمن میں ایک اور بات سنتے چلیے۔ اردو شاعری میں جہاں تک قدما کا تعلق ہے اخلاقیات اور جمالیات میں کوئی تضاد نہیں ملتا۔ دیگر علوم کی طرح شاعری بھی انکشاف حقیقت ہے خواہ وہ حسن کا انکشاف ہو' خوبی کا ہو' یا صداقت کا یا پھر ان سے متعلق انسانی رابطوں کا سودا اگر یہ کہتے ہیں کہ :

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

تو یہ بھی کہتے ہیں کہ :

طبیعت سے فرومایہ کی شعر تر نہیں ہوتا
جواب چاہ کا قطرہ ہے وہ گوہر نہیں ہوتا

قدما کے یہاں ایسی مثالیں بہت ملیں گی۔ کہیں کم کہیں زیادہ اس کی وجہ یہ ہے کہ قدما کے فکری پس منظر میں حقیقت کا یہ تصور ہے کہ وہ واحد ہے اور خود کو صداقت خوبی اور حسن کے حوالے سے کائنات میں منکشف کرتی ہے لہٰذا یہ تینوں حوالے ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ بعض اوقات تو ایک ہی لفظ مثلاً "خوبی" جمالیاتی اور اخلاقی دونوں سطحوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ غالب کا ایک شعر اخلاقی اور جمالیاتی نقطہ نظر کی وحدت کو بڑی خوبی سے ظاہر کرتا ہے۔

ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال

خلد کا ایک در ہے میری گور کے اندر کھلا

۱۸۵۷ء کے بعد نئی فکری تحریکیں چلیں۔ زندگی اور ادب دونوں کے لیے نئے راستوں کی نشاندہی کی گئی۔ نیچر کا فلسفہ آیا اور عقلیت کا طریق کار' پرانا مابعدالطبیعاتی نظام اور علامتی اور استعاراتی طریق کار فرسودہ اور لایعنی قرار پایا۔ اور پھر وہی ہوا جو یورپ میں پہلے ہو چکا تھا۔ عقلیت و اصلاح معاشرہ نیچرل شاعری اور جذباتی ابال اور پھر جمالیاتی نقطہ نظر اور تاثرات کا اظہار ---- یہ الگ بات ہے کہ مغرب میں ان سب تحریکوں کے درمیان وقفہ زیادہ رہا' ہمارے یہاں ان میں زیادہ سرعت آئی مثلاً عقلیت کی تحریک کے ساتھ نیچرل شاعری اور رومانیت کے ساتھ تاثراتی اظہار -- غرض یہ کہ اب زمانہ طرز احساس میں بے ربطی کا آگیا۔

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اردو تنقید کی ابتدا ہی حالی کے عقلی و اخلاقی اور آزاد کے تخیلاتی و تاثراتی طریق کار سے ہوئی۔ حالی اور ان کے دبستان شعر و تنقید کا رد عمل جمالیاتی دبستان کی صورت میں ہوا۔ شاعری تاثرات کا اظہار اور تنقید انھیں تاثرات کی تفہیم و ابلاغ ٹھہری۔ جمالیات و اخلاقیات' عقل و جذبہ علیحدہ علیحدہ اکائیاں بن گئے۔ عقل مابعدالطبیعاتی حقائق کی تجزیہ کاری میں صرف ہونے لگی۔ جذبات' احساسات و تاثرات ادب و شعر میں ڈھلنے لگے۔

نیاز فتح پوری اسی رجحان کے وارث تھے اور تنقید میں جمالیاتی دبستان کے ایک اہم رکن شاعری کے بارے میں ان کا موقف خود انکے لفظوں میں سنئے

> "محبت یا عشق فی الحقیقت ایک شدید قسم کا احساس و تاثر کے اظہار کا نام شعر ہے۔ ہم کسی پھول کو دیکھتے ہیں اور اس کے رنگ و بو سے متاثر ہو کر اس کی تعریف کرتے ہیں' یہ شعر ہے۔ ہم شفق کی رنگینی سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہیں' یہ بھی شعر ہے۔ ہم قوس و قزح کو دیکھتے ہیں اور بے اختیارانہ کلمات تحسین زبان سے نکل جاتے ہیں' یہ بھی شعر

ہے، اس طرح کائنات میں قدرت کے جتنے مظاہر او آثار ہیں وہ
سب انسان کے حواس پر اثر انداز ہوسکتے ہیں اور جو کیفیت ان
سے پیدا ہوتی ہے اس کو ظاہر کردینا شعر ہو سکتا ہے۔ بشرط آنکہ
اس اظہار میں ترنم کو قائم رکھا جائے اور اسی ترنم کے پیدا
کرنے کے لیے مخصوص لب و لہجہ اور مخصوص اوزان وضع کئے
گئے ہیں۔

(انتقادیات مطبوعہ کراچی صفحہ ۸۵۔۸۶)

گو نیاز فتح پوری کے نزدیک شاعری کی اساس دو عناصر پر ہے۔ ایک "تاثرات" اور دوسرے "ترنم" مگر شاعر کا کام یہ بھی ہے کہ وہ اپنے دل میں پیدا ہونے والے تاثرات کو دوسروں تک پہنچائے۔

"شاعر کا کمال یہ ہے کہ جو تاثرات اس کے دل میں پیدا ہوتے
ہیں ان کو ایسے الفاظ و انداز سے ظاہر کردے کہ دوسرا بھی وہی
کیفیت اپنے اندر محسوس کرنے لگے اور اسی کا نام ذوق سلیم
ہے۔"

(انتقادیات صفحہ ۹۱)

تاثرات، ترنم اور ذوق سلیم کے علاوہ کمال شعر کے لیے ایک اور لازمی عنصر انداز بیان ہے۔ چونکہ تاثرات کا اظہار، ترنم کا زیر و بم، جذبات کی بلندی و پستی، سب کا انحصار لفظوں پر ہے، اس لیے نیاز فتح پوری انداز بیان یا اسلوب کو شاعری کا اہم عنصر قرار دیتے ہیں۔

کہتے ہیں

"انداز بیان ہی ایک وہ چیز ہے جس سے مخاطب کو متاثر کیا جاتا
ہے اور گفتگو کا لب و لہجہ پیدا کرنا، مخصوص الفاظ کی مخصوص
ترکیب سے ہی ممکن ہے۔ علاوہ اس کے جذبات کی بلندی و
سخافت سب الفاظ و انداز بیان پر منحصر ہے۔"

(انتقادیات صفحہ ۸۸)

اپنے تنقیدی نقطہ نظر کا اظہار کرتے ہوئے نیاز فتح پوری جمالیاتی موقف کو واضح لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مضامین میں اسکر وائلڈ کا یہ قول ایک سے زیادہ بار پیش کیا ہے کہ

"دنیا میں کسی کتاب کے متعلق یہ گفتگو کرنا کہ وہ اخلاق پر اچھا اثر ڈالتی ہے یا برا لایعنی سی بات ہے۔ اگر کوئی تنقید ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ اچھی لکھی گئی یا بری

(انتقادیات صفحہ ۱۳۸)

اس جمالیاتی موقف کے وہ شدت سے قائل نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اخلاقی بحث کا تعلق تو مواد سے ہوگا لہٰذا وہ تنقید کو محض انداز بیان تک محدود رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے نیاز صاحب اسے محض تاثرات کا اظہار سمجھتے ہیں۔ ان تاثرات کی نوعیت یا ان کی اخلاقی حیثیت پر بحث ان کے تنقیدی طریق کار سے خارج ہے۔ فراق گورکھپوری پر مضمون لکھتے ہوئے وہ نہایت واضح انداز میں شاعری پر کسی قسم کی اخلاقی بحث کو رد کر دیتے ہیں۔

"اس سے شاید کسی کو انکار نہ ہو کہ شاعری صرف تاثرات کی زبان ہے اور اس کے بعد پھر یہ گفتگو کوئی معنی نہیں رکھتی کہ ان تاثرات کی نوعیت کیا ہے چہ جائیکہ اخلاقیات و مذہبیات وغیرہ کی بحث چھیڑنا کہ اسے تو شاید کوئی پیغمبر بھی گوارا نہ کرے اگر وہ شعر کہنے پر آجائے۔"

(انتقادیات صفحہ ۲۹۵)

نیاز صاحب نے اپنے جمالیاتی موقف کا اظہار جابجا اس شدت سے کیا ہے کہ بہ ظاہر ان کے یہاں کسی اخلاقی یا مقصدی زاویہ نظر کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ مقصدیت تو ان کی تنقید میں نہیں جھلکتی مگر اخلاقیات سے وہ پیچھا نہیں چھڑا سکے۔ اگر شاعری محض تاثرات کا اظہار ہے اور اس پر بحث محض اسلوب یا انداز بیان کے اعتبار سے ہی ہو سکتی ہے تو مراتب شعر پر محاکمہ دیتے وقت محض اسلوب پر ہی گفتگو

ہونی چاہیے اور دو شاعروں یا دو دبستانوں میں مرتبہ کا فرق اس طرح متعین ہونا چاہیے کہ ایک کا انداز بیان دوسرے کے مقابلے میں زیادہ موثر ہے۔ مگر نیاز صاحب فرق مراتب کی بات کرتے وقت ذوق کی پستی و بلندی کی بات بھی کرنے لگتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"جب مراتب شعر سے بحث کی جائے گی اور منازل شعر پر گفتگو ہوگی تو اس وقت یہ بھی کہنا پڑے گا کہ فلاں کا ذوق پست ہے اور فلاں کا بلند اور نقد کی یہی ناگوار صورت پیش آجاتی ہے جب دہلی اور لکھنؤ کی شاعری سے کوئی شخص بحث کرتا ہے ورنہ یوں لکھنؤ کی شاعری جب تک مدارج کا سوال نہ پیدا ہو اپنی جگہ یقیناً مکمل چیز ہے۔"

(انتقادیات صفحہ ۱۴۷)

ذوق کی پستی و بلندی کا معیار کیا ہے' نیاز صاحب نے یہ بات وضاحت سے نہیں کی البتہ اس اقتباس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ بات صرف انداز بیاں تک محدود نہیں ہے۔ ذوق کی پستی و بلندی میں خیال و مواد بھی شامل ہے جس کی بلندی سے ذوق بلند اور پستی سے پست ہو جائے گا۔

اس سلسلے میں وہ ایک واضح اشارہ فراق والے مضمون میں کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

"شاعر کے لیے الفاظ کا انتخاب اور طرز ادا دو نہایت ضروری چیزیں ہیں لیکن اگر اسی کے ساتھ خیال بھی پاکیزہ ہو تو کیا کہنا۔"

(انتقادیات صفحہ ۳۰۰)

اس طرح نیاز صاحب اپنے تمام تر جمالیاتی نقطہ نظر کے باوجود' اخلاقیات کے ساتھ تھوڑی بہت رعایت کرتے جاتے ہیں۔ وہ بار بار یہ دعوی کرتے ہیں کہ وہ کلام کا جائزہ لیتے ہوئے محض اسلوب اظہار کو دیکھتے ہیں۔ شعر میں جذبات کی نوعیت کو نہیں پرکھتے محض انداز بیان سے سروکار رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود تنقید کرتے وقت

اس قسم کے الفاظ و جملے استعمال کرتے ہیں جن سے ان کے مزاج میں رچی ہوئی اخلاقیات کا پتہ چلتا ہے مثلاً پایہ تہذیب سے گرا ہوا "مبتذل نگاری" "بیہودہ گوئی" وغیرہ

نیاز صاحب اپنے جمالیاتی موقف کو بڑی شدو مد سے "تصوف کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ تصوف کا مفہوم بھی ان کے ذہن میں شاید یہ ہے کہ اس کا تعلق عالم بالا سے ہے۔ اسی لیے وہ جذبات متاثرات اور انداز بیان پر زور دے کر شاعری کو اسی دنیا کی چیز بنانے پر مصر ہیں --- "عقلیت" کے حوالے سے عالم بالا کو شاعری سے خارج کردیتے ہیں اور جذبات و تاثرات کے نام پر اسے اسی دنیا میں رکھنا چاہتے ہیں۔ فراق گورکھپوری پر مضمون سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "جب میں کسی شاعر کے کلام پر انتقادی نگاہ ڈالتا ہوں تو اس سے بحث نہیں کرتا کہ اس کے جذبات کیسے ہیں بلکہ صرف یہ کہ اس نے اس کے ظاہر کرنے میں کیا اسلوب اختیار کیا اور وہ ذہن سامع تک ان کو پہنچانے میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں۔ بیان خواہ حسن و عشق کا ہو یا "نہر کی پن چکی" کا اس سے غرض نہیں۔ دیکھنے کی چیز صرف یہ ہے کہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ واقعی الفاظ سے ادا ہوا بھی ہے یا نہیں اور پھر چونکہ میں اسی دنیا کا آدمی ہوں جہاں الفاظ کا شرمندہ معنی ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے اور اس دنیا کے علاوہ میں کسی ایسی دنیا کا قائل نہیں ہوں جہاں "معنی" شرمندہ الفاظ نہیں ہوتے۔ اس لیے میں یہی چاہتا ہوں کہ کم از کم شاعری اسی "پر معصیت" دنیا کی کی جائے کیونکہ معصومیت کا تعلق محض "لڑکپن" سے ہے اور شعر نام ہے جوانی کا"
>
> (انتقادیات صفحہ ۲۹۶)

تصوف کی شاعری کے بارے میں نیاز صاحب کے رجحانات کے متعلق جائزہ ابھی

مکمل نہیں ہوا۔ یہاں مندرجہ بالا اقتباس کے حوالے سے ایک ضمنی بات سن لیجئے نیاز فتح پوری صاحب ویسے تو شعر کے بارے میں فن برائے فن کے جمالیاتی موقف کے حامی ہیں تاہم وہ شاعری کو محض اظہار تک محدود نہیں رکھتے۔ اس کا ابلاغ بھی چاہتے ہیں۔ یوں وہ شاعر سے ایسے انداز بیان کی توقع کرتے ہیں جو شعری جذبات کو کامیابی کے ساتھ ذہن سامع تک پہنچا دے۔

جہاں تک تصوف کا تعلق ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیاز صاحب کے ذہن میں اس کا کوئی خاص مفہوم ہے جس کی بنا پر وہ اس کے مخالف ہیں ورنہ اپنی تنقیدی تحریروں میں وہ میر تقی میر اور میر درد کے بہت قائل نظر آتے ہیں اور اس علوئے جذبات کے بھی قائل ہیں۔ جو ان حضرات کی شاعری میں تصوف کی وجہ سے پیدا ہوا۔ مومن پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "ہر چند کہ ان کی شاعری درد و میر کی طرح ان جذبات عالیہ کا نتیجہ نہیں جنھیں تصوف سے تعبیر کیا جاتا ہے بلکہ صرف جنسی محبت سے بحث کرتی ہے لیکن کمال یہی ہے کہ مومن نے بلندی جذبات کو یہاں بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔"
>
> (انتقادیات صفحہ ۹۴)

نیاز صاحب کے ذہن میں تصوف کا کیا مفہوم ہے اس کے بارے میں ان کی تحریروں سے کچھ واضح نہیں ہوتا چند اشارے ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تصوف کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں گویا تصوف نام ہے چند ماورائی تصورات و خیالات کے اظہار کا۔ اب چونکہ ان کے نزدیک شاعری نام ہے جذبات و تاثرات کے اظہار کا' اس لئے انسانی زندگی سے ماورا باتوں کے اظہار میں انھیں شاعری نظر نہیں آتی۔ خود کہتے ہیں۔

> "میرے نزدیک شاعری کو تصوف سے متعلق کردینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی خوبصورت عورت سے شادی کرلی جائے کہ اس کے بعد حسن و عشق دونوں کا صفایا ہے نہ عورت عورت رہ جاتی

ہے اور نہ مرد مرد"

(انتقادیات صفحہ ۲۹۷)

ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ :

"یہ غلط ہے کہ میں تصوف کے رنگ سے متنفر ہوں یہ ضرور ہے کہ شاعری کا خون تصوف کے ہاتھ سے مجھے پسند نہیں۔"

(انتقادیات صفحہ ۲۹۸)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیاز صاحب محض ایسے اشعار کو شاعری کے زمرے سے خارج سمجھتے ہیں جن میں تصوف کے نکات بیان کئے گئے ہوں ورنہ وہ اشعار جن میں جذباتی و تاثراتی اظہار ہو خواہ وہ "حقیقت" کی طرف ہی اشارہ کیوں نہ کرتے ہوں، نیاز صاحب کے مفہوم میں اعلیٰ درجے کی شاعری کا رتبہ حاصل کرسکتے ہیں۔ خود کہتے ہیں۔

"مجاز کو بے دھڑک "حقیقت" کہہ دینا اتنا مرغوب نہیں جتنا "حقیقت" کو مجاز کے رنگ میں ظاہر کرنا۔"

(انتقادیات صفحہ ۲۹۸)

غور کیجئے تو نیاز صاحب کے اس جملے سے تصوف کی شاعری کا جواز نکل آتا ہے۔ یہ کتنا بیجانہ ہوگا کہ وہ تمام شعر جو صوفیانہ خیالات رکھتے تھے اسی طریق کار کے حامل تھے۔ مجاز کو حقیقت کہہ دینا تو تصور کا مسلک ہی نہیں ہے۔ وہ شاعر جن کے کلام کے پس منظر میں تصوف کی جھلک نظر آتی ہے، سب کے سب "حقیقت" کو مجاز کے رنگ میں ہی ظاہر کرتے ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ نیاز صاحب نے تصوف کے ساتھ جان بوجھ کر تھوڑی سی رعایت کردی ہو۔ شاید اس لیے کہ وہ میر درد کی شاعری کے بہت قائل تھے۔ وہ ... جذبات میں پاکیزگی اور عمق کی نشاندہی کرتے ہوئے انھیں اس لحاظ سے میر سے بھی بلند پاتے ہیں۔

لکھتے ہیں :

"میر کے یہاں جذبات عشق کا منبع یقیناً درد کا سا عمیق و پاکیزہ نہیں ہے۔"

(انتقادیات صفحہ ۲۶۵)

اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ میر درد کے جذبات عشق کا منبع کیا ہے تو یقیناً نیاز صاحب کا جواب ہوگا تصوف اس کے باوجود وہ "تصوف" کو غزل کے لیے مضر سمجھتے تھے۔ ان کے لفظوں میں سنئے۔

"میرے نزدیک تغزل میں تصوف کو شامل کرلینا ایک غزل گو شاعر کا کمال نہیں بلکہ اس کا عجز ہے۔"

(انتقادیات صفحہ ۱۲۲)

"تصوف کے حدود وہاں سے شروع ہوتے ہیں جہاں عقل کی پرواز ختم ہوتی ہے اور فضا جو ماورائے سرحد عقل و شعور ہے اس کے وسعت کی کوئی انتہا نہیں۔"

(انتقادیات صفحہ ۱۲۷)

ان اقتباسات سے جو چند باتیں ظاہر ہوتی ہیں ان کا شمار کرتے چلئے۔ اول یہ کہ تصوف غزل گو شاعر کیلیے عجز شاعری ہے۔ دویم یہ کہ مومن کا رنگ تغزل اس لیے پراثر ہے کہ وہ تصوف سے پاک ہے۔ سویم یہ کہ ماورائے عقل و شعور فضا جو تصوف کے لیے سازگار ہے غزل کے لیے سازگار نہیں کہ وہاں جذبات و تاثرات کی کیفیات اس طرح موثر نہیں ہو سکتیں جیسی کہ ہماری عقل و شعور کی دنیا میں ہوتی ہیں۔

نیاز صاحب کی تنقید کی تفہیم میں یہ بات اہم ہے کہ وہ بہ بنائے عقل و شعور تصوف کو شاعری سے خارج کردیتے ہیں تاہم شاعری میں عقل و شعور کی گنجائش نہیں پیدا کرتے۔ اس کی بنیاد وہ جذبات و تاثرات کو ہی قرار دیتے ہیں۔ اپنے ذوقی و جمالیاتی نقطہ نظر میں گاہے بہ گاہے تھوڑی بہت اخلاقیات کا جواز پیدا کرلیتے ہیں مگر اخلاقیات کو تنقید کی بنیاد نہیں سمجھتے۔ اس بات پر، کہ ان کا رشتہ حالی کی مقصدی و اخلاقی تنقید سے کیا ہے، بحث بعد میں ہوگی۔ ابھی یہ دیکھتے چلئے کہ اپنے موقف کا

اطلاق وہ اردو غزل پر کس طرح کرتے ہیں۔ ہم نے پہلے کہا ہے کہ کلاسیکی غزل میں اخلاقیات و جمالیات کی کوئی حد بندی نہیں ملتی۔ حقائق کا انکشاف ہے خواہ وہ کسی صداقت کا ہو، خوبی کا ہو یا حسن و معاملات حسن و عشق کا۔ لیکن نیاز صاحب تو شاعری ہی کو محض جذبات و تاثرات کا اظہار کہتے ہیں لہٰذا غزل کو بھی اسی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ غزل کے لغوی معنیٰ کو مدنظر رکھتے ہوئے نیاز صاحب اسے جذبہ محبت سے منسلک کردیتے ہیں۔ لہٰذا ایک حد بندی تو غزل کی اسی طرح ہوگئی کہ اب وہ تمام اشعار جو جذبہ محبت کے اظہار کے بجائے کسی صداقت یا خوبی کے انکشاف سے متعلق ہوں گے جزو غزل نہ ہوں گے۔ محبت کے سلسلے میں بھی ان کا خیال ہے کہ :

> "جس محبت کا تعلق غزل گوئی سے ہے وہ مخصوص ہے اس جذبے سے جو جنسی کشش و خواہش سے پیدا ہوتا ہے.... بعض اصحاب کو میں نے کہتے ہوئے سنا ہے کہ علاوہ جنسی محبت کے ایک چیز ذہنی و روحانی محبت بھی ہے جسے (Intellectual) کہتے ہیں۔ لیکن میں اس کو محض شاعری سمجھتا ہوں اور اس کا وجود جنسی کیفیت سے علیحدہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تاہم اگر تھوڑی دیر کے لیے مان لیا جائے کہ اس عنقا کا وجود ممکن ہے تو بھی اس کا غزل گوئی سے کوئی واسطہ نہیں۔"
>
> (انتقادیات صفحہ ۸٦)

> "تغزل کا تعلق میرے نزدیک صرف ان جذبات محبت سے ہے جو اس گوشت پوست سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کے پورا ہونے کی تمنا ہر محبت کرنے والے کو ہوتی ہے۔"
>
> (انتقادیات صفحہ ۸٦)

لہٰذا غزل کی دوسری حد بندی اس طرح ہوئی کہ انہوں نے اس کا تعلق محض ان جذبات محبت سے قائم کیا جو بقول ان کے اسی "گوشت پوست" کی دنیا میں "گوشت پوست" سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی حتمی رائے یہ ہے کہ "عشق حقیقی"

بالکل بے معنی چیز ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"ممکن ہے وہ لوگ جنھوں نے "عشق حقیقی" کی اصطلاح وضع کی ہے یا جو شاعری میں تصوف کو شامل کر کے صنم اور صمد کا امتیاز اٹھا ڈالنے پر مصر ہیں انہیں مجھ سے اختلاف ہو لیکن میری حقیقی رائے یہی ہے کہ "حقیقی عشق" بالکل بے معنی چیز ہے اور غزل گوئی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔"

(انتقادیات صفحہ ۸۷)

غزل کی تیسری حد بندی اس طرح ہوئی کہ نیاز صاحب نے غزل کے جذبات کو ہجر و فراق اور سوز و گداز کے ساتھ متعلق کر دیا۔ مثلاً سودا کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"وہ فطری سوز و گداز جو غزل گوئی کے لیے ضروری ہے اس سے یہ ناآشنا تھے۔"

(انتقادیات صفحہ ۱۰۱)

غزل کے متعلق ایک عمومی بیان اس طرح دیتے ہیں۔

"غزل گوئی کی وسعتیں زیادہ تر ہجر و فراق کی دنیا سے متعلق ہوا کرتی ہیں۔

(انتقادیات صفحہ ۸۶)

غزل کی ان حد بندیوں کے پیش نظر، اردو شاعری میں نیاز صاحب جس شاعر کے سب سے زیادہ قائل ہیں وہ میر تقی میر ہیں۔ اس لیے کہ شاعری سے بالعموم اور غزل سے بالخصوص جو توقعات وہ رکھتے ہیں انہیں اول میر اور پھر مومن ہی پوری کرتے ہیں۔ میر کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ اردو شاعری کتنی ہی جدید فتوحات حاصل کرے لیکن وہ اس مملکت میں کوئی فاتحانہ قدم نہیں رکھ سکتی جو میر کے قبضے میں آچکی ہے۔ زبان کی حلاوت، عاشقانہ فناؤگی، والہانہ ربودگی، خستگی و برشتگی، کونسی ایسی چیز ہے جو ان کی غزلوں

میں نہیں پائی جاتی۔"

(انتقادیات صفحہ ۳۷)

وہ مومن کے بڑے مداح ہیں۔ اس لیے کہ ان کے کلام میں جذبات محبت "گوشت پوست" سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں خوئے گدایانہ نہیں نیز یوں بھی کہ ان کا کلام "اس چیز سے بالکل پاک ہے جس کو تصوف یا "عشق حقیقی" سے موسوم کیا جاتا ہے۔"

اس کے باوجود انہیں مومن کے معشوق کے کیریکٹر پر اعتراض ہے لکھتے ہیں۔

"اگر ہم مومن کے معشوق کا کیریکٹر ان کے کلام سے متعین کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ بازاری جنس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔"

(انتقادیات صفحہ ۱۲۸)

لہٰذا مومن کے بارے میں اپنی مدح اور تعریف و تحسین کے باوجود یہ نتیجہ نکالتے ہیں جو یقیناً اخلاقی نوعیت کا ہے۔

"اگر ان کی محبت ذرا بلند ہوجاتی تو پھر آج یہ جستجو نہ ہوتی کہ اردو شاعری میں دوسرا میر کون ہوسکتا ہے۔"

(انتقادیات صفحہ ۱۲۸)

میر و مومن کے بعد وہ درد اور قائم کے بھی قائل نظر آتے ہیں لیکن سودا کی طبیعت کو غزل گوئی کے منافی خیال کرتے ہیں۔ گو وہ دیگر اصناف شعر میں سودا کے قائل ہیں مگر غزل اور مثنوی میں وہ انہیں کامیاب خیال نہیں کرتے لکھتے ہیں۔

"ہر حذف میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شیر صحرا ہے جو نیستاں کو چیرتا پھاڑتا چلا آرہا ہے۔ لیکن ان کی یہی تنہا صفت غزل گوئی کے منافی تھی اس لیے وہ اس صنف میں زیادہ کامیاب نہیں ہوئے ..... مثنویوں میں بھی چونکہ سادگی جذبات اور حلاوت زبان کی ضرورت ہے اس لیے میر کے مقابلے میں یہاں

بھی ان کو زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔"

(انتقادیات صفحہ ۳۷)

"غزلوں میں بعض جگہ سودا نے بھی جذبات عاشقانہ سے کام لیا ہے اور سوز و گداز پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن چونکہ ان کی فطرت اس کیفیت کے مناسب نہ تھی اس لیے وہ پوری طرح کامیاب نہ ہوسکے :

(انتقادیات صفحہ ۳۷)

غزل کے بارے میں اپنے خاص معیارات رکھنے کی وجہ سے ہی وہ تغزل کی حد تک مصحفی کو سودا پر فضیلت دیتے ہیں۔

"اگر محض تغزل کو سامنے رکھا جائے تو وہ یقیناً سودا سے بلند مرتبہ رکھتے تھے۔

(انتقادیات صفحہ ۳۷")

غزل کو جذبات محبت تک محدود کرنا' پھر ان جذبات کو "گوشت پوست" کا حاصل سمجھنا' پھر انھیں ہجر و فراق' سوز و گداز سے متعلق کرنا' ان تمام باتوں کا حاصل وہی نتائج ہوسکتے ہیں جن پر نیاز صاحب پہنچے ہیں یہ الگ بات ہے کہ نیاز صاحب اپنے تنقیدی موقف کا اعلان کرتے ہوئے ذوق شعری میں حدود کے قائل بالکل نہ تھے۔ ان کے تنقیدی موقف کے یہاں اور اس سلسلے میں جمالیاتی و ذوقی تنقید کے فریضہ سے ہم آگے چل کر بحث کریں گے البتہ یہاں غزل کے سلسلے میں نیاز صاحب کے ایک اور ضمنی موقف کا ذکر ضروری ہے اور وہ ہے صنعتوں اور محاسن کلام کے بارے میں ان کا تصور اپنی عملی تنقید میں خواہ وہ مومن و غالب پر ہو یا سیماب اکبر آبادی پر' وہ لفظی و معنوی رعایتوں پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں اور اس ضمن میں ہمیں نیاز صاحب کے ذوق شعر کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ تاہم صنعتوں اور محاسن کلام کے بارے میں وہ حالی کے موقف کے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ مثلاً آصف الدولہ کی شاعری پر نہایت ہمدردانہ تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"تشبیہ و استعارے سے ان کا کلام پاک ہے لیکن اگر کبھی کوئی شعر ایسا نکل گیا ہے تو بھی لطف سے خالی نہیں۔"

(انتقادیات صفحہ ۲۸۶)

"درد اور سوز کے یہاں ایہام کی شاعری بالکل نہیں پائی جاتی اور میر کے کلام میں یہ عیب بھی نظر آتا ہے۔"

(انتقادیات صفحہ ۱۰۳)

" (فتح گولکنڈہ سے قبل کے شاعر) جیسے اور جتنے بھی تھے صرف جذبات کا اظہار سادہ الفاظ میں کردیا کرتے تھے اور یہی رنگ اول اول ولی کا بھی رہا ..... (دلی سے واپسی پر) ولی یہ بولی بولنے لگا :
سحر ہے سرور گل جبیں کی ادا۔"

(انتقادیات صفحہ ۹۳)

ان اقتباسات کے پیش نظر شعر کے فنی پہلو کی طرف نیاز صاحب کے یہاں مولانا حالی کے اثرات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ انہیں اثرات کے تحت وہ لکھنوی دبستان شعر میں فنی محاسن کے التزام کو بہ نظر استحسان نہیں محض لکھنوی شاعری ہی میں نہیں' دہلی کی شاعری میں بھی جہاں کہیں فن پر زور نظر آتا ہے وہ اسے رد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ انہیں کے لفظوں میں دیکھیے۔ لکھنوی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

"سوائے چند شاعروں کے' انھوں نے تو بے شک جذبات نگاری سے کام لیا۔ باقی سب نے ضلع جگت ہی میں وقت ضائع کیا۔ دہلی میں بھی ایہام گوئی اور رعایت لفظی کی مثالیں ملتی ہیں لیکن بہت کم۔ اور اگر شاہ نصیر و ذوق کو علیحدہ کردیا جائے تو ایک شاعر بھی ایسا نہ نکلے گا جس نے اپنی غزل گوئی کی بنیاد جذبات نگاری پر قائم نہ کی ہو۔"

(انتقادیات صفحہ ۱۱۹)

اس کے باوجود جب نیاز صاحب فن اور فن کاری کے متعلق اپنے خیالات پیش

کرتے ہیں تو اسے اعلیٰ درجے کی شے قرار دیتے ہیں۔

"آرٹ چونکہ فطرت کی اصلاح ہے اس لیے تصنع و تکلف ہے۔ پھر کسی تصنع کو اس قدر حسن کے ساتھ پیش کرنا کہ وہ تصنع نہ معلوم ہو' ارتقا کا وہ درجہ ہے جس کے نمونے اکثر نظر آنے لگے یا ہم یہ محسوس کرنے لگیں کہ شاید فطرت اسی آرٹ کی محتاج تھی' بہت بلند چیز ہے اور اس کی مثالیں دنیا میں کم نظر آتی ہیں۔"

(نذاکرات نیاز یا مقالات صفحہ ۱۰۹)

غور کیجئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیاز صاحب بیک وقت مولانا حالی کے تنقیدی تصورات اور فن برائے فن کے تنقیدی موقف کے درمیان منڈلاتے نظر آتے ہیں۔ فن کے متعلق خالص نظری معتقدات پیش کرتے وقت وہ خود کو آسکروائلڈ کا ہمنوا بنتے ہیں۔ شاعری پر عملی تنقید کرتے وقت اعلیٰ درجے کے شعری ذوق کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر وہ محاسن کلام' رعایات وغیرہ کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ لیکن اردو شاعری اور اردو غزل کا نظریاتی جائزہ لیتے وقت وہ مولانا حالی کے قدم سے قدم ملاتے ہیں۔ عام طور پر وہ شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے اسے جذبات و تاثرات کے اظہار کے حوالے سے ہی پرکھتے ہیں لیکن لکھنوی شاعری پر محاکمہ کرتے وقت وہ معاشرتی رجحانات پر بھی بحث کرتے ہیں۔

"وہ لکھنوٴ شاعری جس نے اسی ماحول' اس ذہنی پستی' اس اخلاقی فرومائیگی اسی مذہبی تنگ نظری' اور اسی ہیجان بدمستی میں آنکھ کھولی ہو وہ ناسخ و وزیر ہی پیدا کرسکتی تھی نہ کہ مومن اور میر۔ اس میں سحر و صبا ہی کی تخلیق کی اہلیت ہوسکتی تھی نہ کہ درد و قائم کی۔"

(نذاکرات نیاز۔ صفحہ ۱۳۴)

"لکھنوٴ کی شاعری میں الفاظ کی طلسم بندی' کنگھی' چوٹی' انگیا'

انجل، آرسی، سرمہ، بے معنی صنائع و بدائع اور اسی قسم کی بہت
سی سطحی و غیر سنجیدہ خصوصیات کے پیدا ہونے کا سبب یہی تھا کہ
اس وقت کی زندگی ہی ایک جھوٹی زندگی تھی۔"

(مذاکرات نیاز۔ صفحہ ۱۳۴)

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ نیاز صاحب نے شعر کو "جذبات و تاثرات" کا اظہار کہا ہے۔ پھر ان "جذبات و تاثرات" کو "گوشت پوست" سے منسلک کیا ہے۔ غزل میں جذبات کو "سوز و گداز" سے وابستہ کیا ہے، یہاں تک کہ داغ کے یہاں سوز و گداز کی کمی کے باعث نیز بازاری رنگ کی وجہ سے انھیں دلی سے نکال کر لکھنؤ کے کھاتے میں ڈال دیا ہے۔ یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ نیاز صاحب کے ذوق کا معاملہ ہے، مگر شاعری میں ذوق کے حدود اس طرح متعین کرکے نیاز صاحب نے شاعری کی کئی ابعاد کھودیں۔ مثلاً یہ کہ شاعری میں متضاد اور مختلف النوع تجربوں کو آپس میں ضم کردینا، شاعر کا ایک اہم کام ہوتا ہے۔ کسی ایک تجربے کو "عمودی" طور پر بلند کرکے تجربے کے بالاتر منطقوں میں لے جانے کے لیے شاعروں کو محاسن کلام کا سہارا لینا پڑتا ہے یا پھر یہ کہ "افقی" طور پر دو مختلف تجربوں کو یکجا کردینا اور اس طرح تجربے کے منطقے کو وسیع کرنا یہ بھی شاعروں کا اہم کام رہا ہے۔ مگر نیاز صاحب کے ذوق شعری کے حدود میں شاعری کی یہ اہم ابعاد نہیں سماتیں۔ لکھنؤی شاعری پر سخت تنقید کرتے ہوئے وہ ایسے شعروں کی مثالیں دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"لکھنؤ کی بدنام و رسوا شاعری کے نمونے جو رعایت لفظی، ابتذال معنوی، مبالغہ، عریانی، ایہام، اور رکیک تشبیہات وغیرہ متعدد اسقام سے لبریز ہیں۔"

(انتقادیات صفحہ ۱۱۵ - ۱۱۱)

انھیں نمونوں میں وہ مندرجہ ذیل اشعار بھی پیش کرتے ہیں۔

کافر   خط   استوا   بدن   کا
تیری   سونے   کی   کردھنی   ہے

دیکھ کر تجھ کو نہ کیوں کر نعرہ زن ہوں سب رقیب
بیشتر کتوں کو بھکواتا ہے جلوہ ماہ کا
(ناسخ)

گھر سے خدا کے ملتے ہیں مضمون مجھے بلند
فکر سا کمند ہے کعبہ کے بام کی

بیتاب دل کو تسکین ہوتی ہے دید خط سے
وہ بوٹی ہے یہ جس سے پارے کو مارتے ہیں
(آتش)

ساری رگیں ہوئی ہیں تن زار پر نمود
ناطاقتی نے جسم کو مستر بنادیا
(رند)

بغل میں بیٹھے دل کی طرح سے آپ آکر
میں پاؤں پڑتا ہوں اٹھیے نہ درد سر کی طرح
(خلیل)

غور کیجئے تو ان اشعار میں رعایتیں مقصود بالذات نہیں بلکہ وہ تجربات کے دو مختلف النوع احاطوں کو آپس میں مربوط کرتی ہیں اور یہ کام ہمارے شعرا نے بہت کیا۔ غالب کے کلام کی تو یہ ایک خصوصیت ہے۔ انگریزی کے مابعد الطبیعاتی شعرا میں اور پھر جدید شعرا کے یہاں یہ شعر کی ایک خاص تکنیک ہے۔ انگریزی نقاد ایف آر لیولیس نے جدید انگریزی شاعری پر کتاب لکھتے ہوئے اسے جدید طرز شعر کا طرۂ امتیاز بتایا ہے۔ ڈبلیو بی ییس کی اس تمثال پر جس میں بوڑھی عمر کو اس بے پیندے کی کیتلی سے تشبیہ دی گئی ہے جو کتے کی دم سے بندھی ہوئی ہو۔ انھوں نے انگریزی جدیدیت کی بنیاد رکھ دی۔ ہمارے یہاں یہ کام ڈیڑھ سو برس پہلے ہو چکا ہے۔ مصحفی کو ہی دیکھ

لیجیے۔

بھلا درستی اعضائے پیر کیا ہووے
کہ جیسے رسی سے ٹوٹا کواڑ باندھ دیا

تاہم رومانی و جمالیاتی مزاج ایسی تشبیہات کا متحمل نہیں ہوسکتا لہٰذا نیاز صاحب کے نقطہ نظر کی صراحت اس حوالے سے کی جاسکتی ہے۔

تاہم نیاز صاحب فن تنقید کی ذمہ داریوں سے بخوبی واقف ہیں اور اس ضمن میں انھوں نے بڑی بصیرت افروز باتیں کہی ہیں۔ جمالیاتی و ذوقی تنقید کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ نقاد کو اپنے ذوق کی تربیت اس طرح کرنی چاہیے کہ وہ ہر رنگ اور ہر کیفیت کا لطف اٹھاسکے۔ بصورت دیگر ناقد اپنی کم مائیگی کے باعث فن پارے سے صحیح حظ نہ اٹھا سکے گا اور نہ ہی اس پر صحیح محاکمہ دے سکے گا۔ وہ لکھتے ہیں:

"انتقاد کی ایک عام غلطی جس میں ہر شخص مبتلا نظر آتا ہے یہ ہے کہ نقاد سب سے پہلے یہ دیکھتا ہے کہ لکھنے والے نے اس کے ذوق کی رعایت کس حد تک کی ہے اور اس کے نقطہ خیال سے کون کون سا حصہ ایک تصنیف کا کمل کیا جاسکتا ہے اور اس کے بعد ایک قطعی حکم لگا دیتا ہے کہ فلاں جزو ایک کتاب کا اچھا اور فلاں خراب ہے۔ میرے نزدیک یہ اصولی غلطی ہے۔ اگر ایک شخص کا دماغ زندگی کے مختلف شعبوں، کارگاہ حیات کے کثیر الانواع مناظر، جذبات انسانی کے مختلف، تکمیل فن کی متعدد اشکال، اور فطرت کے بو قلموں مظاہرے علیحدہ علیحدہ لطف اندوز ہونے کی اہلیت نہیں رکھتا تو اس کو انتقادی ذمہ داریاں اپنے سر نہ لینی چاہئیں۔ کیونکہ اس کے لیے ایک ایسے دماغ کی ضرورت ہے جو ہمہ گیر ہو اور ہر چیز کی جداگانہ حیثیت و امتیاز کو سمجھ کر اس کے نقائص و محاسن کا درک کر سکے۔"

(انتقادیات صفحہ ۳۷۹)

نیاز فتح پوری نے اپنی تنقید میں ناقد کی ذمہ داریوں کو بڑی حد تک نبھایا ہے۔ ان کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے نہایت موثر انداز میں اپنے جمالیاتی و ذوقی موقف کے اعتبار سے مقصدی و اصلاحی تنقید کو رد کیا ہے۔ ایسے وقت میں جب کہ ان کے چاروں طرف ناقدین اردو شاعری اور اردو غزل کا تیاپانچا کر رہے تھے اور بیشتر ادبی سرمائے کو ردی کی ٹوکری میں ڈال رہے تھے' نیاز صاحب نے نہایت واضح اور مدلل انداز میں اردو غزل اور اردو شاعری کی وکالت کی۔ جمالیاتی و تاثراتی نقاد کے اعتبار سے ان کی حیثیت اردو تنقید میں مسلم ہے' البتہ ان کے محاکمے سخت ہیں۔ فراق صاحب بھی جمالیاتی نقاد ہیں مگر وہ استاد ذوق کی خوبیوں کے بھی قائل ہیں۔ نیاز صاحب ان سے مختلف یوں ہیں کہ انھوں نے حالی کی عقلیت' اور اخلاقی نقطہ نظر بھی وراثت میں پایا ہے۔ فنی تکلف کے وہ قائل ضرور ہیں' لیکن اکثر اوقات انھیں تکلف محض تکلف نظر آتا ہے اور یوں وہ فنی محاسن سے بدظن نظر آتے ہیں۔ تاثراتی نقطہ نظر کے اعتبار سے وہ آزاد کے وارث بھی ہیں لیکن ایک فرق کے ساتھ۔ آزاد اپنے شعری نظریات کو اکثر تاثراتی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اس کے برعکس نیاز صاحب کے یہاں عقلی و استدلالی انداز کے باعث انتہا درجے کی وضاحت ہے۔ شعر کے ذوق اور شعری محاکموں کے اعتبار سے نیاز صاحب کی تنقید کے حوالے سے اعلیٰ درجے کے ذوق کی تربیت ہو سکتی ہے بشرطیکہ ان کے حدود کا خیال رکھا جائے۔

پروفیسر ڈاکٹر مسعود حسین

نیاز فتح پوری کا اسلوبِ نگارش

نیاز فتح پوری کی قد آور ادبی شخصیت کا سایہ بیسویں صدی کے پانچ دہوں تک اردو کے نثری ادب پر پڑتا رہا ہے۔ شاعر' افسانہ نویس' انشاء پرداز' مکتوب نگار اور صحافی کی حیثیت سے وہ بذات ایک ادارہ اور دبستان رہے ہیں۔ ان کا علم قاموسی تھا اور ان کی علمیت ہمہ جہت جو اردو' عربی اور فارسی زبان و ادب سے لے کر انگریزی اور ہندی کو محیط تھی۔ علوم معاشرتی میں وہ تاریخ' اسلامیات' فلسفہ اور مذہب میں گہری نظر رکھتے تھے۔ سب سے بڑھ کر وہ ایک بے مثل صحافی تھے جنہوں نے نگار کے ذریعے ایک پوری نسل کی ادبی تربیت کی ہے۔

ایسے شخص کے اسلوب نگارش کے بارے میں لکھنا کارے دارد' اس لیے تجزیہ کرنے سے قبل موضوع کی حدبندی ضروری ہے یعنی میرا مقالہ ان کی انشا پردازی اور مکتوبات کے ادبی اسلوب تک محدود رہے گا۔ ادبی اسلوب کے بارے میں بحث کرنے سے پہلے مناسب ہوگا اگر ہم نیاز کی شخصیت کے بارے میں کچھ حقائق اور تاثرات پیش کر سکیں۔ نیاز ایک زبردست انفرادیت کے مالک تھے' اس میں ان کی افغانی نسل اور وراثت کا بڑا دخل تھا۔ اس اعتبار سے ان کے ہم عصروں میں صرف جوش ملیح آبادی ان کے ہمسر کہے جا سکتے ہیں' لیکن وہ جوش سے کہیں زیادہ پڑھے لکھے انسان تھے۔ دونوں میں قدر مشترک ان کے جنسی مسہجات اور جنس مخالف کی کشش تھی' جو دونوں کے تخلیقی ادب کے زبردست محرکات رہے ہیں۔ اس اعتبار سے سجاد حیدر یلدرم (جن کا وہ خود کو مقلد کہتے تھے) یا مہدی افادی اور سجاد انصاری بہت زیادہ شستہ و رفتہ شخصیتیں تھیں۔ ان سب نے اپنے ادب لطیف کا محور جنس لطیف کو بنایا ہے'

لیکن نیاز کے لیے عورت مرکزی کردار کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے اپنے مکتوبات میں بارہا دوستوں اور مبتدیوں کو مشورہ دیا ہے کہ غزل کی شاعری کرنا ہے تو کسی سے محبت کرو۔ افلاطونی محبت کے وہ قائل نہیں تھے۔ ٹیگور، جن کی گیتان جلی کو "عرض نغمہ" کے نام سے اردو داں طبقے سے سب سے پہلے انھوں نے ۱۹۱۲ء میں روشناس کرایا، اس طرح کہ اردو انشاپردازی میں ٹیگوریت کی تحریک سی چلادی اور اپنے ادب کا مقابلہ کرتے ہوئے انھوں نے ۱۹۶۱ء میں دیئے گئے ایک انٹرویو میں کتنی گہری بات کہی ہے :

> "ٹیگور کی شاعری داستان ناآسودگی و ناتمامی اور زندگی بھی یکسر حسرت ناکامی۔ فرق یہ تھا کہ ٹیگور کے سامنے خالص حقیقت تھی اور میرے سامنے خالص مجاز۔ حقیقت ان کے سمجھ میں نہ آئی، مجاز میرے ہاتھ نہ آیا، آخر کار ہم دونوں صوفی ہوگئے۔"

مجھے اس موقع پر ولی کا وہ مشہور شعر یاد آرہا ہے :

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا

نیاز نے اپنی فطرت کے تقاضوں سے مجبور ہوکر خالص مجاز تک اپنی رسائی کی حد بندی کر دی ہے۔ یہی ان کی رومانیت کا راز ہے۔ ان کا یہ اصرار کہ غزل صرف وہ شخص کہہ سکتا ہے جو "حسن و عشق" کی وادی سے گزرا ہو، اسی کے تحت ہے۔ اسی لیے شاعری میں انھوں نے مومن کی بازیافت کی اور انتقادیات (حصہ اول) میں اصغر گونڈوی کے دوسرے مجموعہ کلام "سرور زندگی" اور اس کے ساتھ متصوفانہ شاعری کی دھجیاں بکھیردی ہیں۔ لیکن اس وقت نیاز کا انتقادی نقطہ نظر ہمارے زیر بحث نہیں۔ اس کی محدودیت بھی ان کے اسی رومانی نقطہ نظر سے پیدا ہوتی ہے جس کے بہترین مظہر ان کے افسانے، انشائیے اور مکتوبات ہیں۔ اردو شاعری میں نیاز کی جذباتی تربیت میرو مومن نے کی ہے اور تخیلی رہبری بیدل و غالب نے۔ انشائے لطیف میں سجاد حیدر یلدرم کو انھوں نے اپنا امام تسلیم کیا ہے۔ گیتان جلی کے ترجمے میں انھوں نے اپنا

تصور شعر ان الفاظ میں پیش کیا ہے :

"دو چیزیں شاعری کی جان ہیں، تخیل کی رنگینی مگر عمق کے ساتھ۔ زبان کا ترنم مگر سادگی لیے ہوئے ......"

یہ ان کے "شعر منثور" پر بھی صادق آتا ہے۔ ان کا سارا ادب الفاظ میں تخیل کی کشیدہ کاری سے بھرا پڑا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں :

"ادھر چاند کی دیوی اپنی مینائے سیمیں سے ہلکے رنگ کی شراب زریں چھلکاتی ہوئی نمودار ہو رہی تھی اور سطح آب پر سایہ کی تاریکی جو مشرق کی جانب سمٹی جا رہی تھی، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سمندر بیدار ہو کر آہستہ آہستہ آنکھیں کھول رہا ہے۔"

(نگارستان ص ۱۱)

"وادی کوہ قاف میں سفید پھولوں کی کثرت سے ایک طوفان عریانی بپا تھا۔ فرط تعطر سے پنکھڑیاں جابجاشق ہو گئی تھیں۔ چاند چادر سیمیں پھیلا کر اس پر اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی موجیں جن میں ضیائے ماہ بس کر رہ گئی تھی، یہ معلوم ہوتا تھا نقرئی زنجیریں ہیں اور جناب گھونگھرو کے دانے جو صبا کے سبک و نازک پاؤں میں فرش آب پر ہنگام رقص نکل کر رہ گئے ہیں۔ کرۂ آب یاداشت نیلوفر جو جو کلی کہیں کھل کر رہ گئی تھی اور اس کے اندر قطرۂ آب جگمگا رہا تھا، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ناہید فلک کا بت کسی شوالے میں رکھا ہے۔"

(مکتوبات، حصہ اول ص ۱۱)

"تمام کائنات پر ایک سکون مطلق طاری تھا۔ جمنا اپنی نیلگوں چادر میں چاند کا مکھڑا چھپانے کی کوشش کر رہی تھی اور ناکام

ہو کر ساحل پر سر پٹک رہی تھی۔ متحرک امواج آب میں نثر ضیا کا
وہ عالم تھا کہ گویا حوریں اپنی زلفوں کی افشاں دھونے کے لیے
پانی میں اتر آئی ہیں۔"

(مکتوبات، حصہ اول ص ۱۱۱)

یہ فطرت کی دیوی کی تصویریں ہیں جنھیں نیاز کے رنگین تخیل نے اچھوتی تشبیہات اور استعارات کے ذریعے تراشا ہے۔ لیکن نیاز کے لیے فطرت، عورت کا بدل نہیں بن سکتی اس لیے انھوں نے اپنے تخیل کے بہترین رنگ اس کا سراپا بنانے میں صرف کیے ہیں اس لیے کہ ان کے پاس حسی تجربات کا ایک لازوال خزانہ ہے جس کے لیے ان کی افغانی جبلتیں خام مواد فراہم کرتی ہیں جسے اقبال نے صرف چند لمحات میں محسوس کیا ہے۔

"حسن نسوانی ہے بجلی تیری فطرت کے لیے۔"

نیاز نے ہر ہر قدم پر اسے پایا ہے۔ جنس، نیاز کی بے پناہ طاقت ہے جو ان کے تخیل کے لیے مہمیز کا حکم رکھتی ہے اور جب بھی نسائی پیکر سامنے سے گزر جاتا ہے تو دکٹر ہیوگو کے الفاظ میں ان کے زمین و آسمان اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔

"خدا کا وجود ثابت کرنے کے لیے لوگ خدا جانے کیا کیا بے
سروپا دلائل پیش کرتے ہیں، حالانکہ اس سے زیادہ روشن دلیل
اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ایک حسین عورت بھی پیدا کر سکتا ہے۔
آپ خود بخود غور کیجیے کہ چنبیلی اور گلاب کے افشردہ کو منجمد
کرکے اس سے ایک مجسمہ جمیل تیار کرنا، اس کی رگوں میں
آتش سیال دوڑا دینا اور کمر کے دونوں طرف کا بلور نکال کر سینے
میں بھر دینا تاکہ ایک ہی وقت میں شباب کی نزاکت و قوت
دونوں کی منفی و مثبت رو کی طرح دیکھنے والے کو مسحور کرلیں،
سوائے خدا کے کوئی اور کر سکتا ہے؟"

(جمالستان ص ۱۲۹)

نثر کے اسی لطیف پھیلاؤ کو شاعر نے شعر کے کوزے میں اس طرح بند کیا ہے :

جو گوشے گوشے میں پنہاں ہے اس کے راہ گریز
خیال گم ہوا جاتا ہے قد رعنا میں

نیاز کے نگار خانے کی چند اور تصویریں :

"ایک سانچے میں ڈھلی ہوئی چمپئی رنگ کی مورت، سر سے پاؤں تک لوچ ہی لوچ، اعضاء کے لحاظ سے سراپا تناسب و موزونیت، ہر ہر ادا سے نشہ بخش و سحر انگیز، ہیئات کے اعتبار سے یکسر برق جوالہ، تاثرات کے لحاظ سے بالکل چھوئی موئی اور محبت کی پذیرائی میں ہمہ تن درد، آہ، کراہ"

(جمالستان ص ۷۵)

"اس کا رنگ جسم معلوم ہوتا کہ نستوں دار فردوس کی صباحت میں ہلکا سا رنگ شفق ملا کر بلوریں جلد کے نیچے دوڑا دیا ہے۔ آنکھوں کے سکر و خمار کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کبھی کوئی پوری نگاہ کسی پر ڈال دی تو معلوم ہوا کہ کوئی سیلاب ہے جو ابدیت کی طرف بہائے لیے جارہا ہے۔"

(نگارستان ص ۱۷۱)

"عورت ایک روشنی ہے جسے ہم چھوسکتے ہیں، ایک نکہت ہے جس سے ہم گفتگو کرسکتے ہیں، ایک حلاوت ہے جو آنکھوں سے چکھی جاسکتی ہے، ایک موسیقی ہے جو آنکھوں سے سنی جاسکتی ہے۔"

(نگارستان ص

اس رومانی عورت سے نیاز نے جب بھی سرکشی کی ہے اور اس کی سماجی حقیقت اور ذمہ داریوں کو جتانے کی کوشش کی، نیاز کے اسلوب کا فوراً زوال شروع ہو جاتا ہے۔ ان کا طویل افسانہ "شہاب کی سرگزشت" میں اس قسم کے اصلاحی اور خطیبانہ اسلوب کے بے شمار پیراگراف مل جائیں گے :

"یہ صبح و شام اپنے صحیح فرائض زندگی کو بھول کر گھنٹوں تک سنوارنے والیاں، یہ اپنے بے باک تبسموں، اپنی دلبر نگاہوں، اپنی جری و شوخ چتونوں سے دنیا کو مالوف کر دینے کی آرزو رکھتے ہوئے خود کسی سے محبت نہ کر سکنے والیاں، یاد رکھو ان کے تبسم میں زہر ہے، ان کی نگاہیں سم آلود ہیں، اور یہ وہ ناگنیں ہیں جن کو دنیا کے تہذیب و تمدن نے عالم میں صرف ہلاکت پھیلانے کے لیے چاروں طرف منتشر کر رکھا ہے۔"

(شہاب کی سرگزشت ص ۳۶)

عورت کے بارے میں یہ عمل اور رد عمل "نیاز آخرالزماں" کے یہاں ایک دور سے وابستہ ہے یعنی رومانی دور۔ چوں کہ نیاز نرے شاعر نہ تھے بلکہ کھلے دماغ اور وسیع مطالعہ کے مالک تھے اس لیے حقیقت سے گریز کرنے کے باوجود وہ حقیقت کے قریب آجاتے ہیں۔ اس وقت یہ "غزال رومانی" اپنی انشاء کی چوکڑیاں بھول جاتا ہے۔

نیاز کا ادبی اسلوب اگر صرف تشبیہات و استعارات کا ڈھیر ہوتا تو اس کی جاذبیت کا جادو متن کی قرات میں نہ ہوتا۔ شعر کے اثر کو گہرا کرنے میں وزن کی خاص اہمیت ہے۔ اچھی نثر کا بھی اپنا ایک وزن ہوتا ہے، جس میں یکسانیت کے بجائے تنوع ملتا ہے، موسیقی کے زیر و بم کے بجائے لہجے کا اتار چڑھاؤ ملتا ہے، اسی میں تشبیہ و استعارات کا کارواں مدہم چال سے اپنا سفر طے کرتا ہے، نثر کا وزن کچھ مصوتوں اور مصمتوں کے تانے بانے سے بنتا ہے اور کچھ جملوں کے دروبست سے۔ نیاز کی نثر باواز پڑھی جانے کے قابل ہے۔ دوسری صورت میں تربیت یافتہ "اندرونی کوش" سے بھی اسے سنا جا سکتا ہے :

"یہ کہہ کر اس نے اپنے لانبے بال نچوڑے اور شاعر کے قدموں
پر موتیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ شاعر نے، جو بالکل خاموش دونوں
ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھا تھا نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھا اور پھر اسی
طرح گردن جھکالی، دیوی اس کا یہ انداز دیکھ کر ہنس پڑی اور
شاعر کے سامنے بے شمار نقرئی پھول بکھر گئے۔"

ایک اور اقتباس میں صوتی آرکسٹرا کے پس منظر میں ابھرتی ہوئی چند تصویریں
دیکھئے :

"راجپوتوں کی لڑکیاں ہیں بلند و بالا، صحیح و توانا، تیوریاں چڑھی
ہوئی، گردنیں تنی ہوئی، آنکھوں میں تیر، مانگوں میں عبیر، ابروؤں
میں خنجر، بالوں میں عنبر، ہاتھوں میں مہندی، ماتھے پر بندی، اب
اب سے کیا کہوں کیا چیز ہیں ؟"

ایسے ہی نثری اسلوب کے ڈانڈے شعر سے جا ملتے ہیں۔ ہرچند مقررہ اوزان سے
عاری ہے لیکن ان کا اپنا ایک وزن ہے، اسی لیے دل پر یہ شعر ہی کا اثر کرتا ہے۔
مترنم زبان کی ایک اور مثال جس میں الفاظ رقاصہ کے گھنگھروؤں کی طرح بجتے ہیں۔
"ایک رقاصہ سے" نیازیوں مخاطب ہوتے ہیں :

"وہ تیرا لحن گلوسوز وہ ساز میں ڈوبی ہوئی آواز، ایسی ڈوبی ہوئی کہ
یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ تیری آواز صدائے ساز ہے یا
صدائے ساز تیری آواز ہے ... ہنگام رقص وہ تیری شوخ اور
متحرک چتونیں، جن کے نظام حرکت سے اصول ریاضی منضبط
ہو سکتے ہیں، وہ پھڑکنے والی ابروئیں جن کی نازک لرزش سے
ایک مصور کا قلم اپنی رفتار درست کر سکتا ہے۔۔"

(نگارستان، ایک رقاصہ سے)

اس اقتباس کا تجزیہ کیجئے تو اصوات کی سطح پر "ز" "س" "ر" صفیری اور لرزشی

آوازوں کی تکرار، غنہ آوازوں کی جھنکار اور طویل مصوتوں "آ" اور "اے" کی بھرمار سے ساز و آواز کے سارے دائرے بننے لگتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے، نیاز کے ذخیرۂ الفاظ کا ماخذ عربی فارسی لغات ہیں۔ "جذبات بھاشا" سے واقف ہونے کے باوجود انھوں نے لغات بھاکا سے بہت کم استفادہ کیا ہے۔ تراکیب لفظی انھوں نے یا تو اساتذہ اردو فارسی سے لیں ہیں یا خود تراشی ہیں۔ ان کے ذہن میں کسی مبتدی کی درسیات میں فارسی کی کیا اہمیت تھی۔ اس کا اندازہ ان کے ایک مکتوب کے اس اقتباس سے کیا جاسکتا ہے:

> "آپ نے اچھا کیا کہ عزیز سلمہ کو سب سے پہلے فارسی شروع کرادی ..... میرے نزدیک پہلے کلاسیکل فارسی پر عبور ہوجانا ضروری ہے۔ جدید فارسی علوم و فنون کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی توقعات اپنے اندر رکھتی ہو لیکن نہ جمالیاتی ذوق اس سے تحریک میں آتا ہے نہ فنی تکمیل ہوتی ہے۔"
>
> اس کے بعد شاہنامہ، ظہوری، ابوالفضل، غالب کی مثنویاں، عرفی و خاقانی قصائد، سعدی، فیضی، خسرو اور حافظ نظیری کی غزلیات کا تذکرہ کرنے کے بعد بیدل پر تان ٹوٹتی ہے جو ان کے الفاظ میں "اپنے سوا تمام لٹریچر سے انسان کو بے نیاز بنادیتا ہے۔"

جس ذہن کی پرورش اس ادبی ماحول میں ہوئی ہو اس کے اسلوب نگارش کا جھکاؤ فارسی زبان و ادب کی جانب ہونا ایک لازمی امر ہے۔ نیاز نے اپنے اس ذہنی جھکاؤ کی وجہ سے بہت کچھ کھویا بھی ہے۔ اس کے یہاں اردو کے روزمرے اور محاورے کی چاشنی نہیں ملتی۔ مزاح کی بھی کمی ہے۔ انُ کے یہاں رنگینیٔ خیال موجود ہے، نزاکت خیال، جو مہدی افادی کے ادب میں ملتی ہے، مفقود ہے۔ اس کے لیے مہدی افادی کا ماخذ انگریزی زبان و ادب ہے، نیاز کا سہارا اردو و فارسی اساتذہ کا کلام ہے۔ ناصر علی کی طرح انھیں اردو محاورے پر قدرت نہیں۔ بعض اوقات اپنے بے پناہ تخیل کی رو میں وہ ایسے عربی فارسی الفاظ اور تراکیب استعمال کرجاتے ہیں جن کا اردو زبان سے

دور کا بھی تعلق نہیں۔

"محبت محبت، ایک جذبہ فانی کا انعکاس، داعیات شباب کا ایک
فوری جوش، سیلاب شباب کا ایک موقت مد"

(ایک شاعر کا انجام ص ۶۹)

اسلوب کا یہ انداز "شہاب کی سرگزشت" میں شروع سے آخر تک ملتا ہے جس
میں ایک نقاد کے بقول "نیاز کا اسلوب اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے" (اردو
نثر میں ادب لطیف : عبدالودود خاں ص ۲۱۴) نمونہ ملاحظہ ہو :

"بمبئی کا بہترین حسن اور حسن کی بہترین خود آرائیاں، تہذیب و تمدن کے بہترین
ملبوس کی بہترین زرکاریاں، جلوۂ بے محابا کی بے پناہ عشوہ سازیاں، ناز و کرشمہ کی محشر
خیز فسوں سازیاں، جمال کی بے نیازیاں، یہ تھا وہ تھیٹر جہاں محمود شہاب پہنچے۔"

(شہاب کی سرگزشت ص ۱۳۶)

اس قسم کی عبارت میں نزاکت خیال تک مفقود ہے، صرف بے جان الفاظ کے
ڈھیر ہیں جن میں رومانیت کی روح ناپید ہے اس لیے کہ یہ جذبہ سے عاری ہے۔

نیاز کا شوق عربی و فارسی دانی کا اظہار ان کی ان تراکیب سے بھی ہوتا ہے جو نہ
صرف دور افتادہ ہیں بلکہ مغلق الفاظ کا گورکھ دھندہ ہیں۔ مثلاً "برق صبیح کی عریانیاں"
"یاسمینی شانہ و دوش پر آب سنبلیں"

(نگارستان)

"لب کا بادہ چکاں ہونا" "جوش جوانی میں التماش فشار" (جمالستان)

"حلقۂ زلف کا مخطط دائرہ" (نگارستان)

مومن کی شاعری کے بارے میں رقم طراز ہیں :

"دنیائے شاعری مشکل سے ایسے ایجاد سدید بیان جزیل اور
عبارت انیق کی پاکیزہ مثال پیش کر سکتی ہے۔"

(انتقادیات، حصہ اول ص ۳۶)

اسی طرح "استبعاد حقیقی" "ناساعد مناکحت" وجہ نکوہش، عادت مستمرہ، قابضہ

مسدود، عقد انامل، جسارت مستحو اور "سلاست مقالی" کی تراکیب ہیں جو ایک ایسے ادیب سے یادگار ہیں جو درد و میر کی شاعری کا پرستار ہے۔

انگریزی کے ایک صاحب طرز ادیب Lucas نے ایک جگہ لکھا ہے "میرے لیے اسٹائل بغیر تشبیہ و استعارے کے ایک ایسے دن کی مانند ہے جو سورج سے محروم ہو یا ایک ایسا خیابان جس میں پرندے مفقود ہوں۔" غالباً نیاز بھی اسی کے قائل تھے۔ وہ تشبیہ و استعارے کے بغیر لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ درحقیقت کسی بھی زبان کا بڑا حصہ "مردہ استعاروں" پر مشتمل ہوتا ہے، اس لیے ایجاد پسند ذہن تزئین خیاں کے لیے نئے نئے استعارات تراشتا ہے۔ اس کے لیے صرف عربی فارسی کا سہارا لینا کسی بھی اردو کے ادیب کے لیے جائز نہیں۔ اس طرح وہ زبان کے ایک بڑے حصے سے دور جاپڑتا ہے۔ نیاز ہی کے زمانے میں پریم چند نے زبان کے اس دوسرے حصے کے امکانات کو بھرپور انداز میں آزمایا ہے اور داد تحسین لی ہے۔

اردو ایک "ریختہ زبان" ہے۔ اس کے ادیب پر اس کے تمام اجزائے ترکیبی کو موقع و محل کے لحاظ سے بروئے کار لانے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس کا حسن اور توانائی اس کے "ریختہ پن" میں ہے۔ نیاز کا شمار اردو کے ان ادیبوں میں ہوگا جس نے اس زبان کے "تار حریر دو رنگ" میں سے صرف ایک رنگ کا اپنے لیے انتخاب کیا ہے۔

رشید حسن خاں

نیاز اور آزادیِ فکر

ایسے لوگوں کی تعداد کچھ کم نہیں جنھوں نے اس صدی میں، کسی خاص موضوع یا بعض موضوعات میں درجہ کمال حاصل کیا ہو، اور ان موضوعات کی نسبت سے پائیدار شہرت کو اپنی یادگار کے طور پر چھوڑ گئے ہوں، لیکن ایسے لوگوں کی تعداد کم ہے جنھوں نے ناموری کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کو اس طرح متاثر کیا ہو کہ جس نسل نے اس عہد میں شعور کی آنکھیں کھولی ہوں، اس کی ذہنی تربیت اور بالیدگی شعور میں ان کی تحریروں کے اثرات کار فرما رہے ہوں۔ کوئی بھی منصف مزاج اور صاحب نظر جب بھی ان لوگوں کو یاد کرے گا، تو اس مختصر فہرست میں نیاز فتح پوری کا نام شامل کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پائے گا۔

نیاز کی اہم تحریروں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ :

۱۔ ان کا ایک حصہ چونکا دینے والے مذہبی مباحث سے متعلق ہے۔

۲۔ دوسرا قابل ذکر حصہ وہ ہے جس میں زبان و بیان کے مباحث اس طرح معرض بیان میں آئے ہیں کہ ان میں بھی وہی رنگ اور وہی انداز ہے جو ادبی اور لسانی شعور کو ایک طرح کی کشمکش سے دو چار کر دیتا ہے۔

۳۔ ان مذہبی اور ادبی تحریروں سے مجموعی طور پر ایسے شعور کی آب یاری ہوتی ہے جو ادبی تحقیق کے فروغ میں معاون بنتا ہے۔ میری نظر میں یہ تین اہم پہلو ہیں نیاز کی تحریروں کے اور ان تحریروں کے اثرات کے۔ اس مضمون میں انھی تینوں پہلوؤں پر، اسی ترتیب کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔ میں یہ واضح کر دوں کہ یہاں بحث اس سے نہیں کہ نیاز کی تحریروں میں جو مسائل زیر بحث آئے ہیں، ان میں غلط اور صحیح کا

تناسب کیا ہے۔ موضوع بحث یہاں یہ ہے کہ نیاز کی ایسی تحریروں نے کس طرح اور کس قدر اپنے عہد پر اثر ڈالا اور نئے شعور کی تربیت میں حصہ لیا۔

اصل بحث سے پہلے، چند ضمنی باتوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا :

نیاز درس نظامی کے طالب علم رہے تھے، یعنی ابتدائی مذہبی تعلیم انھوں نے باضابطہ پائی تھی۔ اس طرح مدرسے کی فضا، نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم کے اثرات کو براہ راست دیکھا اور سمجھا تھا۔ یہ بھی محسوس کیا تھا کہ ان مدارس میں تعلیم پانے والے ذہین طالب علموں پر کیا گزرتی ہے اور وہ کن ذہنی کیفیتوں سے دو چار ہوتے ہیں۔ اس بنیاد پر ایسے مباحث کے سلسلے میں مخاطب کی حیثیت سے، درس نظامی سے تعلق رکھنے والے طلبہ کا یہ طبقہ بھی اگر ان کے ذہن میں رہا ہو تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

یہاں پر مزید گفتگو سے پہلے یہ بات بھی واضح ہو جانا چاہیے کہ یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ مذہبی مسائل پر بحث کرنے کا خیال ان کو نگار کے اجرا کے بعد آیا، اور اس سے یہ مطلب لیا جائے کہ یہ سارا معاملہ محض صحافتی سرگرمیوں کا ایک حصہ تھا۔ اگر انھوں نے درس نظامی کے تحت ابتدائی تعلیم حاصل نہ کی ہوتی تو اس صورت میں یہ بات کہی جا سکتی تھی۔ اصل تصور تو ان کے ذہن میں، تجربے کی صورت میں محفوظ تھا۔ جب ایک وسیلۂ اظہار ہاتھ آیا تو اس وقت یہ بحثیں شروع ہوئیں۔

ایک بات اور : ان کے جو حالات زندگی ہمارے سامنے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں تجرباتی سوجھ بوجھ بلا کی تھی۔ وہ ادبی صحافت کے تقاضوں سے خوب واقف تھے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے مزاج میں "چھیڑ چلی جائے" سے لطف اندوز ہونے کا بھی رجحان کار فرما تھا جو ترقی پاکر، آداب صحافت اور آئین گرم بازاری کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ اس طرح یہ لازم تھا کہ تخاطب کا دائرہ وسیع ہو۔ یوں خالص علمی مسائل کے لیے بھی انھوں نے ایسا انداز بیان اختیار کیا جس کا انداز خواہ ویسا علمی نہ ہو جیسا ان مباحث کا ہونا چاہیے، مگر وہ اوسط درجے کے لوگوں کے لیے

اجنبی نہ ہو۔ یہ عملی پہلو تھا اس انداز فکر کا۔ اس کے بغیر نگار جاری نہیں رہ سکتا تھا اور نگار کے بغیر کسی بحث کو اٹھانا مشکل تھا۔ اس لیے ان کی تجرباتی سوجھ بوجھ، کھل کر علمی مسائل کو اس طرح بیان کرنا کہ روایتی انداز بحث و نظر کا معیار برقرار نہ رہے، اور اس سلسلے میں بعض دوسرے معاملات کے اعتراف کے ساتھ ساتھ، یہ بات ذہن میں ضرور محفوظ رہنا چاہیے کہ ان سب کے بغیر ایک ایسے رسالے کو اتنی طویل مدت تک جاری نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ اس سے مقصود ان بعض معاملات کا جواز ثابت کرنا نہیں جو قابل اعتراض ہوسکتے ہیں اور قابل اعتراض تھے! مقصود تو صرف یہ ہے کہ صورت حال کو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے اور اجزا کو الگ الگ کر کے دیکھا جائے تاکہ صحیح طور پر نتائج نکالے جاسکیں۔

ان چند ابتدائی معروضات کے بعد، اب میں اس بحث کے پہلے حصے کو شروع کرتا ہوں یعنی ان کی مذہبی تحریروں سے متاثر ہونے والوں کی بڑی تعداد تھی جن میں جدید تعلیم یافتہ لوگ، جدید تعلیم پانے والے نوجوان اور درس نظامی کے طالب علم بھی شامل تھے۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ اس نسبتاً مختصر تحریر میں ان سب لوگوں کو موضوع بحث بنا سکوں اور اثرات کا جائزہ لے سکوں، اسی بنا پر میں نے آخر الذکر طبقے کو منتخب کیا ہے اس جائزے کے لیے۔ اس ترجیح کی وجہ وہی ہے کہ نیاز نے خود بھی درس نظامی کے طالب علم کی حیثیت سے پہلی بار ان مسائل کو محسوس کیا تھا، اس لیے یہ بعید از قیاس نہیں کہ یہ گروہ ان کے ذہن میں اولین مخاطب کی حیثیت سے آیا ہو۔ میں اس داستان کو اپنے حوالے سے بیان کرنا چاہوں گا۔ اس بیان میں ایک فرد اور ایک علاقے کا تعین ہے، لیکن یہ عرض کردوں کہ ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں یہی صورت حال کار فرما تھی اور افراد اسی طرح اثر قبول کر رہے تھے۔

(۱)

روہیل کھنڈ کے علاقے میں ۱۹۴۷ء سے پہلے تک عربی مدارس کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ ہر شہر میں دو تین یا اس سے زیادہ مدرسے ضرور تھے۔ میرے شہر شاہ جہان پور میں عربی کے چار مدرسے تھے، جہاں باقاعدہ درس نظام کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس شہر

میں دینی تعلیم کو فروغ ملا تھا۔ اس زمانے سے جب بانی درس نظامی ملا نظام الدین فرنگی محلی کے جلیل القدر صاحب زادے مولانا عبد العلی بحر العلوم' لکھنؤ سے ترک وطن کر کے شاہ جہان پور تشریف لائے تھے۔ یہاں ان کا قیام تقریباً بیس سال تک رہا۔ مولانا کے دم قدم سے اس شہر میں عربی تعلیم نے بہت فروغ پایا۔ اب سب عربی مدرسوں کا احوال کم و بیش ایک سا تھا۔ عربی کی تعلیم اس طرح دی جاتی تھی کہ ذہن کی بیش تر صلاحیت صرف و نحو کی غیر ضروری کتابوں کو پڑھنے اور رٹنے میں صرف ہو جایا کرتی تھی۔ اس کے بعد منطق کی بھول بھلیوں میں بہت کچھ پھرنا پڑتا تھا۔ نصاب میں شامل زیادہ کتابیں ایسی تھیں جو پرانے متنوں کی شرحیں تھیں۔ مختصر سا متن' اس کی طویل شرح۔ ہر شرح پر مفصل حاشیہ موجود' بعض شرحوں کے ساتھ کئی کئی حواشی۔ طلبہ کے لیے ضروری تھا کہ وہ ان سب کو دیکھیں' اور لفظی بحثوں میں کمال حاصل کریں۔ عبارت پڑھنا اچھی طرح آجاتا تھا' لیکن عربی میں چار جملے لکھنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہو پاتی تھی۔ پچھلے پچاس برس اور سو برس میں کیا نئی دریافتیں ہوئی ہیں' اور پچھلے پانچ سو سال میں کتنی نئی کتابیں لکھی گئی ہیں' دنیا میں کیا ہو رہا ہے' خیال اور فکر نے کتنے نئے سوالات پیدا کیے ہیں' علم کی وسعت اور ترقی نے کتنے نئے موضوعات کو نمایاں کیا ہے' ان مدرسوں کے طالب علم یعنی ہم لوگ عموماً ان سب امور سے ناواقف رہتے تھے۔ زندگی سے 'گرد و پیش سے اور فکر و نظر کے نئے تقاضوں سے بے خبری گویا لازمہ تعلیم بن کر رہ گئی تھی۔ بحثیں اس پر ہوتی تھیں کہ اس ضمیر کا مرجع کہاں ہے اور فلاں لفظ کی اصل کیا ہے اور اس جملے کی ترکیب نحوی کیسے ہوئی اور یہاں کون سا منطقی مغالطہ ہے اور وہاں کون سی لفظی بحث ہے۔

اس سے ہٹ کر ایک صورت حال یہ بھی تھی کہ ہر مدرسہ کسی خاص جماعت سے تعلق رکھتا تھا۔ بریلوی' دیو بندی' اہل حدیث وغیرہ اور ایسے ہر مدرسے میں اس پر بہت زور دیا جاتا تھا کہ دوسرے فریقوں نے جو کچھ کہا' وہ ناقابل قبول ہے۔

میں مدرسہ بحر العلوم میں پڑھتا تھا۔ فقہ کی درمیانی کتابیں پڑھ رہا تھا اور بار بار ذہن میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے تھے جن کو ڈر کے مارے استاد کے سامنے

پیش نہیں کر سکتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب غلامی ہندوستان میں ہے نہیں تو ہم اس کے مسائل کیوں پڑھیں کہ اسے آزاد کیسے کیا جائے اور اس کے ساتھ سلوک کیسا کیا جائے۔ یا مثلاً عقائد کی بحث میں بہت سی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مسلمان اس قدر جلد کافر کیسے ہو جاتا ہے۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ زمین گھومتی ہے یا نہیں گھومتی' اس کا تعلق دینی تعلیم سے کیا ہے اور آسمان لوہے کا ہے یا تانبے کا' اس کا تعلق عقائد سے کیا ہے۔ غرض ایسے بہت سے سوالات اس زمانے میں ذہن میں پیدا ہوا کرتے تھے۔ ہم جن کتابوں کو نصاب میں پڑھتے تھے ان میں بیشتر کے متعلق ہم کو یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ان کا مصنف کون ہے اور وہ کس زمانے میں لکھی گئیں۔ اور اگر دو سو برس پہلے لکھی گئی ہیں تو کیا اس کے بعد سے اب تک کوئی نئی بات اس سلسلے میں معلوم نہیں ہوئی؟ ہم اپنے گرد و پیش سے باخبر تھے اور دنیا کی وسعتوں سے نا آشنا۔

ساتھیوں میں نصف سے زیادہ طالب علم تو وہ ہوتے تھے جو آسام اور بنگال سے آتے تھے اور جن میں سے اکثر ذہانت سے خالی اور روشنی طبع سے محروم ہوتے تھے۔ وہ صرف سند لینے اور کسی مسجد کی پیش امامی کرنے کی اہلیت حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ ان کا کوئی مسئلہ نہیں تھا' لیکن باقی چند طالب علم ذرا بھی "کیوں" اور "کیا" کے مارے ہوئے ہوتے تھے۔ وہ ہمیشہ ایک کشمکش کا شکار رہا کرتے تھے اور ذہن میں عجیب سے سوالات گونجا کرتے تھے۔ زبان بند رہتی تھی' لیکن ذہن میں الجھنیں اپنا پیچ دار راستہ بناتی رہتی تھیں۔ ہم معمولی معمولی باتوں پر کفر کا فتوا سنا کرتے تھے اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیسے ہوگیا۔ خیر' میں کیا اور میری بساط کیا' استاد الاساتذہ مولانا شبلی نے اس سلسلے میں جگہ جگہ جو کچھ لکھا ہے وہ اس دور میں مدرسوں کی فضا اور انداز تعلیم کی بہتر طور پر آئینہ داری کرتا ہے۔

میں مولانا شبلی کے دو مختصر سے اقتباسات پیش کیے دے رہا ہوں جن سے میری باتوں کی زیادہ وضاحت ہو جائے گی۔ مولانا نے ایک جگہ لکھا ہے:

"ایک طرف تو ہمارے مولوی مسلمانوں کو کافر بنانے میں

معروف ہیں اور اس کام میں وہ کوشش کرتے ہیں، جو صحابہ کافروں کے مسلمان بنانے میں کرتے تھے۔ دوسری طرف یورپ کی علمی فیاضیوں کا بادل، عالم پر آب حیات برسا رہا ہے۔ دنیا کی تمام قوموں کے مردہ علوم، فنون، تاریخ اور یادگاریں زمین کے طبقے الٹ الٹ کر نکالے جا رہے ہیں اور دنیا کی نمائش گاہ، ان گم شدہ جواہرات سے اس طرح سجا دی گئی ہے گویا پچھلا زمانہ اسی سرو سامانی سے دوبارہ سامنے آگیا ہے۔"

عربی کی قدیم کتابوں کو یورپ نے جس دلچسپی اور دیدہ ریزی کے ساتھ جدید اصول تدوین کے مطابق مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ ایک مقالے میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

"دنیا کو ہم سے اس کام کی توقع تھی، لیکن ابھی ہم کو اور ضروری کاموں سے فرصت کہاں ہے۔ حمد اللہ کے بعض ضروری مقامات اب تک حل نا شدہ ہیں۔ شرح ملا کی ایک ضمیر کا مرجع اب تک متعین نہیں ہوا۔ اور خیر یہ سب کام تو اٹھا رکھے جاسکتے تھے، لیکن شیعوں کی تکفیر تو بہرحال مقدم ہے اور گو وہابیوں کا استیصال اس قدر ضروری نہ ہو، لیکن آخر اس کی اہمیت سے تو انکار نہیں ہو سکتا۔"

یہ عام صورت حال تھی مدرسوں کی۔ ذہنوں پر پہرے بیٹھے ہوئے تھے اور فکر و نظر کی جولانیوں کے لیے اور نئے شعور کی کارفرمائیوں کے لیے گنجائش گویا نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ کسی ذہین طالب علم کے لیے اس فضا میں اطمینان اور تسکین کا حصول ممکن نہیں تھا۔ میں جب ۱۹۳۹ء کے اواخر میں مدرسے سے باہر نکلا ہوں تب اردو کی بعض کتابیں پڑھنے کا موقع ملا، بعض رسالے دیکھے اور کچھ دنوں کے بعد اتفاق سے نگار کے بعض شمارے پڑھنے کو مل گئے۔ عربی مدارس کے طالب علم اردو کو کوئی مستقل زبان نہیں سمجھا کرتے تھے اور ایک حد تک حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے

تھے' اس لیے اردو ادبیات سے میری شناسائی مدرسے سے نکلنے کے بعد شروع ہوئی۔ نگار کے ان شماروں میں مذہبی معاملات سے متعلق بعض ایسی بحثیں پڑھیں جن کو پڑھ کر پہلے اچنبھا ہوا' پھر غصہ آیا اور اس کے بعد یہ شوق پیدا ہوا کہ اس سلسلے کی دوسری بحثیں بھی پڑھی جائیں۔ اس طرح تلاش شروع ہوئی اور جس قدر تحریریں ہاتھ آسکیں' ان کو پڑھ ڈالا' ایک بار نہیں... کئی بار۔ اس کے بعد وہ سارے سوالات اچانک ذہن میں ابھر آئے جو مدرسے کی تعلیم کے دوران پیدا ہوئے تھے اور جو اس وقت یا تو زبان تک نہیں آپائے تھے' یا شافی جواب سے محروم رہے تھے۔ ایک مشکل یہ ہوئی کہ ان سے ملتے جلتے کئی نئے اور زیادہ پریشان کن سوالات پیدا ہوگئے۔ یہ پہلا بھرپور حملہ تھا ایک سادہ اور صاف ذہن پر۔ کئی مہینے کے بعد ذرا سنبھلا اور غور کرنا شروع کیا۔ پھر یہ محسوس ہوا کہ جو کچھ ان مضامین میں لکھا گیا ہے' ممکن ہے وہ سب ٹھیک نہ ہو' لیکن یہ باتیں ہیں غور طلب۔ بس یہاں سے ذہن میں نئے سرے سے اور نئے انداز سے مسائل و معاملات کو سمجھنے کی اور دریافت کرنے کی لگن پیدا ہوئی اور یہ خیال جاگزیں ہوا کہ بہت سی حقیقتیں اور سچائیاں ہمیں پوری طرح یا اچھی طرح معلوم نہیں اور ان کی صحیح صورت دیکھنے کے لیے بہت پڑھنا' بہت سوچنا اور بہت تلاش سے کام لینا ہوگا۔ یہ گویا تحقیق کے شعور کی پہلی کرن تھی جو ذہن پر پڑی اور دل میں اتر گئی۔

میں نے تحقیق کے اصول اور آداب سیکھے شیرانی مرحوم کی تحریروں سے۔ اس کے بعد قاضی عبد الودود اور ڈاکٹر عبد الستار صدیقی سے استفادہ کیا' اور اس سب سے آخر میں مولانا عرشی مرحوم سے فیض پایا' لیکن سب سے پہلے تحقیق کی طرف متوجہ کیا نیاز کی تحریروں نے۔ ان تحریروں نے تحقیق کی ضرورت کا احساس دلایا اور اس کی اہمیت سے آشنا کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس ذہنی کشمکش سے دوچار کیا جو مکمل تسکین اور کامل اطمینان کا مطالبہ کرتی ہے اور اس تشکیک سے ذہن کو آشنا کیا جو تحقیق کی بنیاد بنتی ہے۔ اگر میں نے مدرسے سے نکلنے کے بعد ان تحریروں کو نہ پڑھا ہوتا میرے ذہن میں پہلے غصے' پھر جھنجلاہٹ اور پھر کشمکش نہ پیدا ہوئی ہوتی اور مزید

غور و فکر کی ضرورت نہ محسوس کی ہوتی، تو اس کا امکان تھا کہ ادبی تحقیق سے شناسائی نہ ہوتی۔

یہ عرض کر دوں کہ یہ داستان صرف ایک فرد کی نہیں، یہ سرگزشت اس عہد کے مجھ جیسے بہت سے نوجوانوں کی ہے۔ کتنے ہی قدامت کے مارے ہوئے ذہن نئی روشنی کی ضرورت سے آشنا ہوئے اور بہت سے پڑھنے والے سنی ہوئی اور پڑھی ہوئی بہت سی باتوں پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت محسوس کرنے لگے۔ یہ عہد ساز کارنامہ تھا جو تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

یہاں ایک دلچسپ حقیقت کی طرف توجہ دلانا بے جا نہ ہوگا کہ جس چیز کو ادبی تحقیق کہتے ہیں، نیاز کو اس سے ذہنی موانست نہیں تھی۔ انھوں نے مختلف شاعروں کے متعلق یا ادبی استفسارات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو تحقیق کے ذیل میں آتا ہے اور یہ حصہ ان کی ایسی تحریروں کا کمزور پہلو ہے۔ کسی بھی کتاب یا تذکرے میں لکھے ہوئے کسی واقعے کو یا تاریخ کو وہ بے تکلف اور بے تامل درج مضمون کر لیتے تھے اور اکثر حوالہ نہیں دیا کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس حد تک تاثراتی تنقید کے زیر اثر رہتے تھے کہ ان کا ذہن ایسے مواقع پر مزید تحقیق و تشخیص کی ضرورت محسوس نہیں کر پاتا تھا۔ یہ بات اس لیے لکھی گئی ہے کہ یہ دلچسپ حقیقت سامنے آسکے کہ جس شخص کی تحریروں نے بہت سے لوگوں کے ذہن کو ادبی تحقیق کی طرف متوجہ کیا وہ خود عملی طور پر اس سے بے تعلق رہا۔

ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ کیا نیاز کی ایسی مذہبی تحریریں جن میں نئے انداز نظر اور حقیقت پسندانہ طرز فکر پر زور دیا گیا ہے اور پرانی تعبیروں، تشریحوں اور تفسیروں کی نفی کی گئی ہے، کیا وہ از اول تا آخر صرف اصل حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کا نتیجہ تھیں؟ اس کے متعلق مختلف رائیں ظاہر کی گئی ہیں۔ کچھ لوگوں نے ایسی تحریروں کو ایک جویائے صداقت اور متلاشی حقیقت کے درد مند دل اور بیدار ذہن کا نتیجہ قرار دیا ہے اور کچھ لوگوں کا یہ خیال رہا ہے کہ اس میں ایک بڑا حصہ ان کی صحافتی اور تجارتی مصلحتوں کا بھی تھا۔ وہ گرمی بازار کے لیے ایسے سامان مہیا کرتے

رہتے تھے اور ایسی بحثیں چھیڑتے رہتے تھے جن سے ان کو فضا بنائے رکھنے میں مدد ملتی تھی، نگار کی شہرت اور اشاعت بڑھتی تھی، خود ان کی کتابوں کی مانگ رہتی تھی اور ان کی علمی اور ادبی شخصیت کا جادو سرچڑھ کر بولتا رہتا تھا۔ ان کی تحریروں میں جو طاقت اور اثر ہے، اس کے پیش نظر یہ کہنا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریریں ایک ایسے شخص کے قلم سے نکلی ہیں جس کا مقصود محض ہنگامہ آرائی اور صرف تجارتی گرم بازاری تھا۔ ان تحریروں میں علمیت کی جو شان ہے، استدلال کا جو منطقی انداز ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمدردی کے ساتھ اور تعلق خاطر کے ساتھ حقائق کو سمجھنے کی جس طرح کوشش کی گئی ہے ان عناصر نے ایسی تحریروں کی وقعت میں اضافہ کیا ہے اور ان میں دوسروں کو متاثر کرنے کی بے مثال کیفیت تہ نشیں کر دی ہے۔ صرف تجارتی اغراض کی خاطر جو کچھ لکھا جاتا ہے اس میں ظاہری سطح پر علمیت کا انداز تو آسکتا ہے، لیکن یہ بات کیسے پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ ایک عہد کا اور اس عہد کے پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں کو بری طرح متاثر کر سکیں۔ دوسری طرف ان کی زندگی کی جو داستان ہمارے سامنے ہے یعنی جس سے ہم واقف ہیں اس میں طرح طرح کے عجیب واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مثلاً دوسروں کی تحریروں کو اپنے نام سے شروع کرنا یا ترجمے کو تصنیف کا درجہ دے دینا یا ایسی ہی بعض اور باتیں جو ان کے سوانح نگار نے لکھی ہیں ان کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان تحریروں میں تجارتی اغراض کا شامل ہونا بعد از قیاس نہیں ہو سکتا۔ محض اپنی آسانی کے لیے ہم یہ فرض کیے لیتے ہیں کہ حقیقت ان دونوں انتہاؤں کے بیچ میں کہیں پر ہے لیکن حقیقت کہیں پر ہو، اور جس شکل میں ہو، واقعہ جو بھی ہو اور جیسا بھی ہو، یہ سچائی بھی اپنی جگہ پر روشن اور درخشاں ہے کہ ان کی انھی تحریروں نے ایک عہد کو، ایک نسل کو اور پڑھے لکھے طبقے کے ایک بڑے حصے کو متاثر کیا ہے اور نئے شعر اور نئے انداز فکر کی تشکیل اور نشوونما میں حصہ لیا ہے اور یہاں پر یہ بحث ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہے کہ ان تحریروں کے وجود میں آنے کے اسباب کیا تھے۔ یہ بات اولین حیثیت اختیار کر لیتی ہے کہ یہ تحریریں عہد ساز تھیں اور ان تحریروں نے قدیم تعلیم یافتہ طبقے

کے ایک خاص گروہ کو اور مسلمانوں کے ایک خاصے بڑے طبقے کو نئے شعور اور نئے انداز فکر کی روشنی بخشی اور نوجوان ذہنوں کو تلاش و تفحص کے ذائقے سے آشنا کیا اور علمی تحقیق کا ذوق ان کے اندر پیدا کیا۔ یہ اتنا بڑا کام تھا کہ کم لوگ ایسے کاموں کو انجام دے پاتے ہیں اور اس اعتبار سے نیاز کی شخصیت عہد ساز تھی اور ان کی حیثیت روشنی کے منارے کی سی تھی۔ ان سے کتنا ہی اختلاف کیا جائے' لیکن ان کی تاریخی اہمت سے انکار نہیں جاسکے گا اور یہ شرف کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔

ایک اور بات یہاں پر کہنے کی ہے : پرانے انداز درس و تدریس اور اسلوب تشریح و تفسیر سے بہت سے لوگ غیر مطمئن تھے۔ بعض نے دبے لفظوں میں اور احتیاط کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اوروں کا کیا ذکر' خود مولانا شبلی اپنے عہد کے علما سے اور ان کے انداز سے غیر مطمئن تھے اور اصلاحات کے خواہاں تھے' جس کی پاداش میں ان کو بہت کچھ سننا پڑا اور بہت کچھ دیکھنا پڑا۔ مولانا ابو الکلام آزاد بھی گروہ میں شامل تھے۔ چوں کہ وہ دنیا سے زیادہ باخبر تھے' نئی علمی فتوحات سے بھی واقف تھے' بدلتے ہوئے حالات پر بھی ان کی نظر تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فطرت کی طرف سے اعلا درجے کی ذہانت کے ساتھ ساتھ اعلا درجے کی خوش مذاقی بھی ان کو ملی تھی' اس لیے وہ بھی غیر مطمئن لوگوں میں سے تھے' لیکن ان کی مشکلیں چند در چند تھیں اور مختلف سیاسی وجوہ کی بنا پر وہ نہ طبقہ علما کو ناراض کرنا چاہتے اور نہ عوام کو بددل دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے ان کی تحریروں میں ان کی آزادی خیال کھل کر جلوہ گر نہیں ہو پائی ہے۔ غرض کہ اصلاح پسند اصحاب نے عدم اطمینان کے باوصف ایسی بحثوں میں کھل کر الجھنا کبھی پسند نہیں کیا جن کی وجہ سے قبول عام پر حرف آسکے۔ نیاز کے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں تھا' اس لیے وہ واضح طور پر اپنے خیالات کو ظاہر کرنے میں آزاد تھے اور انھوں نے اس آزادی سے پوری طرح فائدہ اٹھایا۔ علمائے کرام سے جب ان کا جھگڑا شروع ہوا تو وہ تنہا تھے' اس کے باوصف دلائل کی حد تک وہ کبھی تنہا اور مجبور نہیں دکھائی دیے۔

ایک سوال یہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ آج ان کی ایسی تحریروں کی کیا حیثیت ہے؟ کیا وہ محض تاریخی اہمیت رکھتے ہیں اور اپنے زمانے میں اپنے اثرات کو ظاہر کرنے کے بعد محض یادگار بن کر رہ گئی ہیں؟ اس سوال کا جواب میرے ذہن میں بہت واضح ہے۔ جس تنگ نظری اور کٹر پن کے خلاف نیاز نے اس وقت لکھا تھا' آج بھی وہ تنگ نظری اور کٹر پن موجود ہے بلکہ اضافوں کے ساتھ موجود ہے۔ فروعات کو اصل سے بڑھا دینا آج بھی ہماری روش ہے اور دنیا سے بے خبری طبقہ علما میں عام ہے۔ جب تک یہ صورت حال برقرار رہے گی نیاز کی تحریریں اپنی معنویت کو برقرار رکھیں گی۔

(۲)

اب میں اس بحث کے دوسرے حصے کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں :

آزادی فکر کو' ایک اور پہلو سے بھی نیاز کی تحریروں نے فروغ دیا ۔ ہے اور یہ پہلو خالصتاً ادبی ہے۔ شخصیت پرستی ہماری معاشرت کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ اور "خطائے بزرگاں گرفتن خطا است" کو اکثر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس غیر علمی اور غیر حقیقت پسندانہ روش نے اردو میں ادبی تحقیق کو ایک زمانے تک فروغ سے محروم رکھا اور تنقید کو ایک مدت تک صاف گوئی کے زیادہ قریب نہیں آنے دیا۔ نیاز تنقید کے اس دبستان سے تعلق رکھتے تھے جسے تاثراتی تنقید کا اسکول کہا جاتا ہے۔ ان کا خاص انداز نگارش بھی اس طرز انتقاد کے لیے موزوں قرار پایا۔ نیاز کی ایسی تنقیدی تحریریں شدید شخصیت پسندی و ناپسند سے اور مبالغہ پسندی کے عناصر سے معمور ہیں اور اس لحاظ سے وہ مثالی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اگرچہ ان میں علمی نکات بکھرے ہوئے ملتے ہیں البتہ تنقید کی ایک شق ایسی ہے جس میں وہ بہ ظاہر منفرد نظر آتے ہیں اور وہ ہے زبان و بیان کے لحاظ سے کلام کا جائزہ' جسے شعری احتساب بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے زمانے کے ایسے معروف اور معتبر افراد کو منتخب کیا' جن کی شاعری یا استادی کی دھوم مچی ہوئی تھی اور ایک زمانے تک تسلسل کے ساتھ' ان شعرا کے

کلام کا اس لحاظ سے جائزہ لیا کہ شخصیت پرستی کے روایتی تصور پر کاری ضرب لگی۔ یہ محسوس کیا گیا کہ علم اور نظر کا ساتھ ہو تو آزادی کے ساتھ ہر شخص کے کلام پر گفتگو کی جا سکتی ہے اور یہ ترک ادب نہیں، بلکہ تقاضائے ادب ہے۔ یہ بھی ایک اعتبار سے فکر اور اظہار کی آزادی اور بے باکی کی تبلیغ تھی اور ساتھ ہی زبان و بیان کے نکات کو اور ان سے متعلق مباحث سے ذہنی ربط بڑھا، معائب سخن اور محاسن سخن کے مباحث کی طرف توجہ خاص طور پر مبذول ہوئی اور لفظ و معنی کی نسبتوں میں مطابقت کا عرفان پیدا ہوا اور دوسری طرف نئی نسل نے یہ سیکھا کہ شخصیت کسی کی ہو، وہ کتنا ہی بڑا شاعر ہو یا استاد ہو اور کیسا ہی عالم فاضل ہو، اس کے کلام کا جائزہ لیا جانا اچھے برے کے تکلف کے بغیر اور مکمل آزادی کے ساتھ اور پوری طرح وضاحت کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کرنا چاہیے۔ نیاز نے اسی تسلسل کے ساتھ اور اسی قدر طویل مدت تک اس احتسابی انداز کو کار فرما رکھا کہ اس انداز نے ایک روش اور روایت کی حیثیت اختیار کر لی اور اس روایت نے بھی، جرات فکر اور آزادی اظہار کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔

یہاں بحث مقصود نہیں، بس ضمنی طور پر ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ زبان و بیان کے مباحث کے ذیل میں ایسے مقامات بھی ملتے ہیں، جہاں ایک غیر جانبدار شخص یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ شخصی پسند و ناپسند کی کار فرمائی بالکل صحیح ہے، مگر کہنا یہ ہے کہ یہ پہلو اس بحث میں ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس سے اصل بات پر یا یوں کہیے کہ نتیجے پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ ان مقامات سے قطع نظر کر لی جائے تب بھی یہ اصل حقیقت اپنی جگہ پر رہے گی کہ تنقید کے اس خاص انداز کو ایک مستقل حیثیت اور ایک انداز عطا کرنے کا شرف نیاز کو حاصل ہے اور اس انداز نے بھی ذہنوں میں جرات اور بے باکی کے تصور کو جاگزیں کرنے میں مدد دی ہے۔

(۳)

ان دونوں شقوں کے تحت آنے والی نیاز کی تحریروں کے مجموعی اثرات نے اردو اور ادبی تحقیق کے فروغ میں مدد کی ہے، یہ وہ پہلو ہے جس کی طرف توجہ نہیں کی

گئی۔ وہ خود محقق نہیں تھے۔ ان کے مزاج کو ادبی تحقیق سے دور کی نسبت تھی، مگر
ان کی مذہبی تحریروں نے اور شعری احتساب سے متعلق نگارشات نے بالواسطہ طور پر
ادبی تحقیق کو فروغ میں مدد دی ہے اور یہ ان کی تحریروں کے اثرات کا وہ حصہ ہے
جس کا ذکر ابتدائے مضامین میں کیا گیا تھا۔

اس وقت یہاں جو صاحب علم اور صاحب نظر حضرات موجود ہیں ان میں سے
متعدد افراد کو ادبی تحقیق سے کسی نہ کسی اعتبار سے تعلق خاطر ہوگا' ایسے سبھی
حضرات اس بات سے واقف ہوں گے کہ ادبی تحقیق میں شک کو بنیادی حیثیت حاصل
ہے۔ جو شخص شک نہیں کر سکتا وہ تحقیق بھی نہیں کر سکتا۔ ادبی تحقیق میں صحیح طور
پر نتائج اخذ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مزاج کو سائنسی حقیقت پسندی سے علاقہ
ہو۔ جذباتیت سے قطع تعلق پر قدرت حاصل ہو اور نتائج کو صحیح طور پر مرتب کرنے
کی صلاحیت ہو، مگر یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ حقائق کو دریافت کرنے کا جذبہ اگر کسی
کے یہاں ہے تو وہ تحقیق شروع کرے گا اور جب تحقیق کا عمل شروع ہوگا تو پھر جگہ
جگہ شک کی ناگزیر ضرورت کا احساس ہوگا۔ اگر ذہن اس شک کی اہمیت کو سمجھنے سے
قاصر ہے تو پھر سچائیاں سامنے نہیں آسکیں گی۔ نیاز کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس
صدی کی پانچ دہائیوں میں نوجوان ذہنوں کو اس شک کی ناگزیر ضرورت سے آگاہ کیا
اور اس کا ذائقہ شناس بنایا اور یہ ادبی تحقیق کے لیے ذہنی فضا ہموار کرنے کا بنیادی
عمل تھا۔ اس اعتبار سے اعتماد کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اردو میں ادبی تحقیق
کے فروغ میں بالواسطہ نیاز کا بڑا حصہ ہے۔

مختصر یہ ہے کہ نیاز نے اس صدی کی تیسری دہائی سے لے کر پانچویں بلکہ چھٹی
دہائی تک اپنی تحریروں کے ذریعے اپنے انداز سے آزادی فکر و اظہار کی اس روایت
کی تبلیغ کی، جس کا سنگ بنیاد سرسید نے رکھا تھا۔ نیا تعلیم یافتہ طبقہ اور وہ مصروف
تعلیم نوجوان جو مذہبی تعلیم سے تعلق رکھتے ہوں' ان کے ایک بڑے حصے کو فکر و
خیال کی آزادی کے نئے شعور سے آشنا کیا' ان کی جرات اظہار سے روشناس کیا اور

ذہنوں میں یہ خیال بٹھا دیا کہ جو کچھ کہا جا چکا ہے، اس پر اکتفا کر لینے کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نئی دریافتوں سے اور پرانی حقیقتوں کے عرفان سے محروم رہ جائیں گے۔ بالواسطہ طور پر اس پر زور دیا کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے اور بند نہیں ہونا چاہیے خاص کر یوں کہ ہم اسلام کو دین فطرت کہتے ہیں اور یہ بھی ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ زندگی کے جملہ مسائل و معاملات اور کائنات کے سارے مظاہر و محرکات پر حاوی ہے۔ اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے یہ لازم ہے کہ تحقیق اور تفحص کے دروازے کھلے رہیں۔ یہ عہد ساز کارنامہ تھا۔

نیاز پر جن لوگوں نے سخت اعتراضات کیے وہ کم مرتبہ لوگ نہیں تھے۔ ان میں سے متعدد حضرات علم و فضل کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ رکھتے تھے۔ بات اگر صرف علم و فضل کی ہوتی تو نیاز ان لوگوں کے مقابلے میں کوئی حیثیت حاصل نہیں کر سکتے تھے لیکن مسئلہ قدیم علم سے واقفیت کا اس قدر نہیں تھا جس قدر نئے شعور کی آبیاری اور پرانی حقیقتوں کے نئے عرفان کا تھا اور یہ ان کے معترضین کا کم زور پہلو تھا اس لیے ان قد آور معترضین اور فاضل اکابر کی پیہم مخالفت کے باوصف، نیاز کے اثرات اپنے دائرے کو وسیع کرتے رہے اور آج ہم ان اثرات کی کارفرمائی کو زیادہ اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں اور یہ بھی محسوس کر سکتے ہیں کہ جو حالات اب پیدا ہو رہے ہیں اور قدامت پرستی جس انداز سے اب اپنے آپ کو پھر منوانے پر تلی ہوئی ہے اور تنگ نظری کی تبلیغ کو جس طرح دین کی خدمت کا درجہ دیا جا رہا ہے، ان حالات کے پیش نظر ہمیں شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ کاش اس وقت ہمارے پاس کوئی ایسا شخص ہوتا جو اس روایت کی توسیع کر سکتا اور اسے ایک نئے انداز سے عام کر سکنے پر قدرت رکھتا جس کا آغاز سرسید سے ہوا تھا اور جس کو استحکام نیاز نے بخشا تھا۔ یہ شدید احساس ہی نیاز کی تاریخی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

نیاز، ایک مفکر جو منصور نہ بن سکا

نیاز اور نگار اردو میں آزاد خیالی (یا فکر آزاد) کے ارتقا میں ایک اہم سنگ میل سمجھے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں مجلّہ نگار نے بہ حیثیت مجموعی جو کردار ادا کیا اس کی تفصیل (بلکہ خود اجمال) کی بھی اس وقت گنجائش نہیں، میں اپنے قلم کو نیاز کی آزاد خیالی (یعنی اس کی نوعیت اور اس کے مقام و منصب) تک محدود رکھوں گا۔

نگار کا آغاز جنوری ۱۹۲۲ء میں ہوا لیکن اردو میں (یا برصغیر کے مسلم حلقوں میں) آزاد خیالی کا آغاز ستر اسی برس پہلے ہوچکا تھا، اس کی ابتدائی شکلیں ان مناظرات میں ملتی ہیں جو انگریزوں کی آمد و استحکام کے ساتھ ہی شروع ہوکر، ایک خاص تشکیلی ذہن پیدا کرچکی تھیں۔ امام غزالی نے درست فرمایا ہے کہ مناظرہ حقائق و مسائل کے بارے میں سکون و یقین پیدا کرنے کے لیے ہوتا ہے لیکن اس کے ذریعے یقین و اذعان کے ساتھ ہی ایک تشکیکی رجحان پیدا ہوجاتا ہے۔ یہی حال برصغیر کا ہوا۔

برصغیر کی انیسویں صدی مناظرے کی صدی تھی۔ اس میں ہر طرف ہر مسئلے کے بارے میں بحث و تحقیق کے ہنگامے پیدا ہوئے چنانچہ ان سے ایک خاص حد تک اذعان و یقین میں پختگی بھی پیدا ہوئی لیکن اس کے ساتھ ہی شکوک و شبہات کے کھلے اظہار کے لیے بھی ایک میدان تیار ہوگیا اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، مسلم فرقوں کی باہمی مناظرہ آرائی کے علاوہ، مشرق و مغرب کے متضاد یا مختلف زاویہ ہائے نظر کے مابین بھی بحث و گفتگو کا دروازہ کھل گیا — اس شعبے میں ہم سرسید احمد خاں ہی کو مرکزی شخصیت قرار دیں گے جو مغربی خیالات و نظریات کی طرف میلان کے باعث دین و مذہب کے معاملات میں بھی مغربی علمی نظریات کے حوالے کی ضرورت پر

زور دیتے تھے۔ خصوصاً "تہذیب الاخلاق" کی اشاعت کے بعد عقل اور نیچر کی سند ان کا امتیاز خاص بن گیا۔

نیاز فتح پوری نے جب قلم کی اقلیم میں قدم رکھا اس سے بہت پہلے سرسید کے فوراً بعد شبلی کی زندگی ہی میں، آزاد خیالی کے بہت سے علمبردار ابھر آئے جو اسلام اور مسلمان کی تاریخ کے مسلمات پر طعن کرتے نظر آتے ہیں، ان میں ایک وہ مناظرہ ہے جو کسی نقاب پوش آزاد خیال ریڈیکل اور شبلی کے درمیان ہوا شبلی نے اس کا جواب لکھا وہ مقالات میں موجود ہے۔

اس آزاد خیالی کے ہدف اس سے زیادہ تھے اور ان میں سے اکثر پادریوں اور مغربی مصنفوں (مستشرقوں اور مورخوں) سے اثر پذیری کا نتیجہ تھے، یہ رجحان عموماً دو رخ اختیار کیا کرتا تھا۔ ایک غلامانہ اور مرعوب ذہن کی بغاوت کا — یعنی اسلام اور مسلم تاریخ پر اعتراضات کو من و عن تسلیم کرکے، معترضین کی ہم نوائی (جیسا کہ ریڈیکل صاحب کے یہاں تھی) دوسرا رخ، اسلام سے عقیدت رکھ کر، اعتراضات کی تاویل (جو مغربی اعتراض کو صحیح تسلیم کرکے اعتراض کا مدافعانہ جواب دینے پر مجبور کرتی تھی) اسے ہم مدافعانہ معذرتی انداز کہہ سکتے ہیں۔

اس معذرتی انداز یا طریق کار میں شبلی اور نذیر احمد تک سمجھے جاسکتے ہیں۔ لیکن شبلی کی معذرتی روش یوں ناگوار ثابت نہ ہوئی کہ وہ جہاں تاویل و معذرت کا سہارا لیتے ہیں وہ مغربی نقطۂ نظر اور نظریات پر جارحانہ وار بھی کرتے ہیں جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ وہ مغرب سے مرعوب نہ تھے۔ (اگرچہ مرور زمانہ نے ثابت کیا ہے کہ مخفی سی مرعوبیت شبلی کی تحریروں میں بھی تھی)۔

تاریخی حقائق پر غور کرنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ سرسید کے انتقال کے بعد اور رسالہ تہذیب الاخلاق کی اشاعت ثانی (زیر ادارت محسن الملک) کے بعد ریڈیکل قسم کی بغاوت کا زور خاصا ٹوٹ گیا، اس میں دو دیگر واقعات نے بھی، خاصا حصہ لیا، ایک تو بین الاقوامی سیاسی حالات نے جن میں مغربی طاقتوں نے مسلم ممالک کو ہڑپ کرنے کے لیے جارحانہ کارروائیاں پے در پے کیں جن کے باعث مسلمانانِ ہند کا ذہن

طبقہ (Intelligentsia) بھی مغرب کے ہر قول و فعل کے متعلق محتاط ہو کر چلنے لگا اور عوام کے غیظ و غضب سے بچنے کے لیے قلم میں ملائمت پید کرنے پر مجبور ہو گیا۔
دوسرا واقعہ جس نے غیر محتاط (یا منہ پھٹ) لبرلزم کو محتاط ہونے پر مجبور کیا وہ تو رسالہ مخزن کا اجرا جس نے قلم و فکر کے جوش آزادی کو ادب و انشا کے شعبوں کی طرف منتقل کر دیا۔ اب فکر آزاد خیالی کو دوسرے بہتر وسیلہ ہائے اظہار مل گئے۔ ادب میں نئی اصناف نے وہ میڈیم مہیا کر دیئے جن میں، لکھنے یا سوچنے والے کو دل کی خلش اور تشکیک و اختلاف یا جذبہ احتجاج کے اظہار کے لیے شعر و سخن کے علاوہ مضمون نگاری، افسانوی ادب، ڈراما اور تمثیلی وسائل آسان کر دیئے۔ مغربی زبانوں کے ترجموں سے کسک دور ہو جاتی تھی اور خود اپنی شاعری کی کہنہ روایت سے ہٹ کر ہندی زبانوں کی شاعری کے ترجمے اور مثالیں تسکین کے لیے مفید ثابت ہوئے۔

اس سلسلے میں اتحاد اسلام تحریک نے بھی خاصا حصہ لیا۔ تاہم جنگ عظیم اول میں انگریزوں کی فتح مندی نے مغربی طرز و طور کے رعب و وقار کو بحال کر دیا اگرچہ آزادی ہند کی معتدل تحریک کچھ کچھ ہندیت یا ہندوستانیت کی طرف مائل کرتی رہی۔

بایں ہمہ آزاد فکری اور تشکیک (یا یوں کہیے کہ تحقیق) کا ذوق بھی عام ہو تا گیا جو انگریزی تعلیم و معاشرت کی وسعت و اشاعت کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔

اس صورت حال کے تین اہم نتیجے بر آمد ہوئے۔

اول : روایت (دینی، علمی، ادبی) کے استحکام کے لیے زیادہ موثر کوششیں اس کا اظہار دینی مدارس کے علاوہ ندوۃ العلما اور دارالمصنفین اور رسالہ معارف اعظم گڑھ کی صورت میں ہوا۔

دوم : مشہور عام خیالات، و مصروفیات کے خلاف معتدل احتجاج اور تشکیک آفریں تحقیق۔

سوم : احتجاجی و تشکیکی جذبوں کی تسکین کے لیے جدید اصناف و وسائل کا استعمال۔

اس گفتگو سے صاف ظاہر ہو سکتا ہے کہ نیاز فتح پوری کا تعلق دوسری اور تیسری صنف سے ہے، انھوں نے اپنے ذہنی احتجاجات کے لیے ان دو طریقوں کو استعمال کیا۔

ان کی بعض تحریروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ان کے لیے ممکن ہوتا تو وہ ریڈیکل گروہ کی صف اول میں شامل ہو جاتے لیکن اگر ان کے لیے یہ ممکن نہ ہو سکا اس کے دو سبب تھے اول تو زمانے کا مزاج اور اس معاشرے کا رنگ طبیعت جس میں انھیں قدرت نے خامہ آزمائی کا موقعہ دیا جیسا کہ سطور بالا سے ثابت ہو سکتا ہے دوسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ شدید موثر، عمیق اور ہمہ گیر بغاوت کے لیے مغربی علوم کے جتنے وسیع اور گہرے مطالعہ کی ضرورت تھی وہ انھیں میسر نہیں آیا۔ ان وجوہ سے وہ منصور بننے کی خواہش کے باوجود، منصور کا منصب یا اعزاز حاصل نہ کر سکے۔

در مدرسہ کس رانہ رسد دعویٰ توحید

منزلگہ مردانِ موحد سردار است

اور چونکہ میرے عقیدے کے مطابق قدرت کی ہر بات میں ایک حکمت ہوتی ہے اس لیے میرے نزدیک نیاز کی مندرجہ بالا کوتاہی یا محرومی میں بہت بڑی حکمت یہ تھی کہ وہ "من و یزداں" کی تنگنا سے نکلنے پر مجبور ہو گئے اور علم کی دوسری وادیوں میں پھیل جانے کے علاوہ، اردو کے رومانی ادب کی ثروت میں خاصا اضافہ کر گئے۔ ٹاگور سے ہمیں زیادہ باخبر کر گئے، بھاشا کی معصوم دنیا کے استعارات و کنایات سے آگاہ کر کے اپنی سرزمین کی بوباس سے بہرہ ور کر گئے۔۔ اور بالآخر ہمیں ایک ایسے نگارخانۂ معلومات کا عطیہ دے گئے جس نے ہمیں آگاہ کیا کہ انسانی علم اور جذبات کا حدود اربعہ ان حدوں سے وسیع ہے جن تک معارف اور زمانہ انھیں محدود سمجھتے تھے۔ اور بالآخر جیسا کہ میں پہلے بھی اپنے ایک مضمون میں لکھ چکا ہوں انھوں نے اپنے شعرا کو متنبہ کیا کہ جرائد و رسائل کی کثرت کے یہ معنی نہیں کہ شعر کو بچوں کا کھیل سمجھ لیا جائے اور زبان کے اس مخصوص اور بلند ڈسپلن کو نظرانداز کر دیا جائے جس کے بغیر الفاظ شعریت کے معزز لقب کے مستحق ہی نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ مالہ، وما علیہ میں انھوں نے الفاظ کی عظمت، تقدیس اور جلالت کے جس نصب العین کی طرف توجہ دلائی ہے وہ آج بھی ہمارا شعری دستور العمل بننے کا استحقاق رکھتا ہے۔

۵ میں نے سطور بالا میں (یہ جانتے ہوئے کہ نیاز کی تحقیقی اور کلامی تحریروں کا

سرمایہ خاصا وسیع ہے) صرف "من و یزداں" کا حوالہ اس لیے دیا ہے کہ وہ اگر بدنام ہوئے تو زیادہ تر اس کتاب سے (یا اس قسم کی کتابوں سے) ــ اسی قسم کی تحریروں سے منصوریت کے امید وار بھی تھے ــــ اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ یہ تحریریں بھی مجموعی طور سے، فکر و تحقیق کی توسیع کے حق میں بطور ردعمل، مفید ہی رہیں غیر مفید نہیں رہیں ــ ان تحریروں کی وجہ سے، جوابی طور پر، تحقیق و جستجو میں زیادہ احتیاط اور وسعت نظر کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا ــ فریق مخالف پر یہ ظاہر ہوا بلکہ وہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ ہر مسئلے کا ایک دوسرا رخ بلکہ کئی دوسرے رخ بھی ہو سکتے ہیں اور یہ بھی کہ محض منقولات بیسویں صدی کے کسی آدمی کو متاثر نہیں کر سکتیں۔ میرے رائے میں تحقیق کی تحریک کے لیے اس سے فائدہ ہی ہوا نقصان کم ہوا ہے۔ میں نے سنا ہے بہت سے لوگوں نے نیاز کی ہنگامہ خیز تحریروں کو پڑھنے کے بعد انھیں مضامین پر زیر تحریر، کتابوں میں ترمیم و اضافہ کرنا ضروری خیال کیا۔ تو کیا یہ فائدہ کچھ کم ہے ؟

پھر بھی مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ نیاز جیسے مفکر اور ادیب کے سرمایہ تحریر کا کمزور ترین حصہ بھی یہی ہے اگرچہ میں یہ اضافہ ضرور کروں گا کہ انھیں تحریروں نے نیاز کو ایک انفرادیت بھی عطا کی، وہ محض ادیب نہ تھے انھیں ہم آزادی (لبرلزم) کی تحریک کا ایک باوقار مفکر بھی سمجھنے پر مجبور ہیں۔

پس جب میں انھیں ایک باوقار مفکر ہونے کا اعزاز دے رہا ہوں تو پھر میں ان کے انھیں وسیلہ وقار تحریروں کو ان کے رشحات قلم کا کمزور ترین حصہ کیوں قرار دے رہا ہوں ؟ ظاہر ہے کہ اس الزام کا جواب میرے ذمے ہے۔

میرا جواب یہ ہے کہ یہ نیاز کی بدقسمتی تھی کہ انھوں نے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا جس پر ان سے پہلے اور ان کے بعد لکھنے والا تقریباً ہر مصنف گھاٹے ہی میں رہا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ انھوں نے غلط مواد پیش کیا۔ نہیں ایسا نہیں خسارہ اس میں رہا کہ انھوں نے دین و روحانیات کی باتوں کو فلسفہ و سائنسی نظریات کے معیار سے جانچنے کی کوشش کی ــ اور عقلی فیصلے دیئے حالانکہ ہر چند کہ دین (اسلام) کی

باتیں عقل کے خلاف نہیں لیکن دین کی ہر بات کو عقل (عقل حاضر) کے معیار سے جانچنا غلط طریق کار ہے۔ کیوں ؟ اس لیے کہ عقلی اور سائنسی نظریے خود بھی یقینی نہیں۔ پس جب ایک شے خود ہی یقینی نہیں وہ کسی دوسری شے کی صداقت کے لیے میزان کیسے بن سکتی ہے۔

راقم الحروف نے نیاز فتح پوری کی اکثر تحریریں پڑھی ہیں' ان میں سے کچھ تو تاریخ سے متعلق ہیں مگر بیشتر فلسفہ اور سائنسی نظریات سے۔ تو اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے جس سائنسی نظریے (خصوصاً طبیعات کے کسی نظریے کو) معیار تحقیق بنایا ہے۔ وہ تبدیلیوں کے کئی نئے انکشافات سے خود ہی مجروح ہوچکا ہے' سائنس طبیعات ہو حیاتیات ہو' نباتیات ہو' ان میں سے ہر ایک وہ نہیں رہی جو آج سے پچاس سال پہلے تھی۔

میں توضیح کی غرض سے صرف طبیعیات کی مثال پیش کرتا ہوں۔

غور فرمایئے کہ کلاسیکی طبیعیات کیا تھی ؟ یہی کہ کائنات ایک میکانکی (مشینی) شے ہے جو مقررہ اصولوں کے مطابق چلی جارہی ہے اور اس کی حرکت مسلسل ہے' لیکن کچھ مدت کے بعد گونج اٹھی کہ یہ حرکت مسلسل نہیں بلکہ غیر مسلسل ہے۔ یہ چھلانگوں کے انداز میں حرکت کرتی ہے گویا علت و معلول (جس پر نیاز صاحب — بلکہ شبلی تک) بڑا زور دیتے رہے ختم ہوگیا۔

پہلے کائنات کے مطابق قوانین تسلیم کیے جاتے تھے لیکن آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت نے مطلقیت کا جنازہ نکال دیا۔

روشنی کا نظریہ نیوٹن کے بعد کبھی موجی حرکت قرار دیا گیا' کبھی موجی اور ذراتی حرکت کا مجموعہ۔

ایک زمانے میں حیاتین کو ایک مائع خیال کیا جاتا تھا مگر انیسویں صدی میں کہا گیا کہ یہ سالمات کی بے ہنگم حرکت کا نتیجہ ہے۔ ۱۹۲۷ء میں ہائزن برگ نے یہ فیصلہ سنادیا کہ ذروں کی باتیں تو کررہے ہو مگر خود ذرہ کیا' اس کا کسی کو کچھ علم نہیں' غرض کوانٹم' اور اصول عدم یقین نے طبیعیات کی دنیا کو زیر و زبر کردیا۔

پس جب سائنسی نظریہ خود ہی ڈانواں ڈول ہے تو اس بنیاد پر وحی و الہام' اور قیامت اور عقبیٰ کی باتوں کے فیصلے صادر کرنا کمزور بات نہیں تو اور کیا ہے ؟

اور یہ کمزوری نیاز ہی کی نہیں سب عقل پسند اس میں مبتلا ہیں --- اور اب تو یہ ضرورت واقعی محسوس کی جارہی ہے کہ عقل و تجربہ اپنی جگہ درست مگر روحانیات ایمانیات کے بہت سے شعبے' بلادلیل ہی تسلیم کرلینے چاہئیں ان کو فٹ سے غلط کہنا درست نہیں۔ ممکن ہے کل ہی ان کے انکشافات کے لیے قدرت' ادراک انسانی کے لیے قابل یقین آسانیاں پید کردے۔

ڈاکٹر وزیر آغا

نیاز فتح پوری اور نگار

نیاز اور نگار ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ نگار کو اگر نیاز ایسا مدیر اور مفکر میسر نہ آتا تو وہ کبھی ایک عہد ساز رسالہ نہ کہلا سکتا اور اگر نیاز کو نگار کے ذریعے اپنے افکار اور تنقیدی رویے کو دور دور تک پھیلانے کا موقعہ نہ ملتا تو ان کے اپنے زمانے کے اردو ادب پر ان کی چھاپ اتنی واضح طور پر نظر نہ آتی۔ یوں لگتا ہے جیسے "نگار" نیاز فتح پوری صاحب کی زبان بھی تھا اور ان کا قلم بھی لیکن ساتھ ہی ایک ایسا آئینہ بھی تھا جس میں نہ صرف نیاز فتح پوری کی ادبی شخصیت منعکس ہو رہی تھی بلکہ جس میں وہ اس سارے ادبی تناظر کو بھی منعکس کر رہے تھے جسے ان کی نظروں نے گرفت میں لے لیا تھا۔

اردو ادب میں نیاز فتح پوری کی ایک حیثیت تو افسانہ نگار کی ہے گو آج اردو افسانہ اپنی رومانی ابتدا سے بہت آگے علامت اور تجرید کی فضا کو مس کرنے کے بعد کہانی کو نئے العباد کے ساتھ پیش کرنے کے قابل ہو چکا ہے تاہم نیاز فتح پوری صاحب کے زمانے میں بھی جب ابھی اردو افسانے کے ساتوں رنگ سامنے نہیں آئے تھے تو نیاز صاحب نے اپنی افسانہ نگاری کے ذریعے اس کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں ایک قابل ذکر خدمت سرانجام دی۔"

"شہاب کی سرگزشت" ان کے اپنے زمانے کے اس نوجوان کی کہانی ہے جو اگرچہ اپنے رومانی ماحول میں قید ہے مگر جسے ماضی اور مستقبل پر ایک نظر ڈالنے کی قدرت بھی حاصل ہو چکی ہے۔ یہی نوجوان آگے چل کر اردو افسانہ میں بھی کبھی ایک باغی، کبھی ایک مفکر اور کبھی ایک انتہائی حساس شخصیت کے روپ میں ابھرا لیکن نیاز کے ہاں اس میں رومانی افسردہ دلی کا وہ انداز صاف نظر آتا ہے جو اس کے بعد کے

رویوں کا پیش خیمہ تھا اس اعتبار سے دیکھیے تو نیاز فتح پوری کو اردو افسانے کی تاریخ میں ایک قابل ذکر مقام حاصل ہے۔

مگر نیاز کی اصل حیثیت ان کے انتقاد اور ... فکری رویے کے باعث ہے۔ فکری اعتبار سے نیاز ایک انتہائی' کشادہ نظر انسان تھے۔ وہ جذباتی طور پر کسی نظریے کو آگے بڑھانے کے حق میں نہیں تھے اور نہ وہ تنگ نظری جو آج کے مفکرین کو ایک عارضے کی طرح لاحق نظر آتی ہے' نیاز صاحب کے معاملے میں کوئی مسئلہ ہی نہیں تھی۔ وہ بہت سے نازک فکری معاملات میں بھی بڑے بیباکانہ اور دو ٹوک انداز میں بات کرنے کے قائل تھے اور زمانہ سازی کے میلان سے انھیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ یہ اقتباسات دیکھیے۔

"تغزل کا تعلق میرے نزدیک صرف ان جذبات محبت سے ہے جو اس گوشت پوست کی دنیا میں گوشت پوست سے پیدا ہوتے ہیں۔ جن کے پورا ہونے کی تمنا ہر محبت کرنے والے کو ہوتی ہے۔"

"میری حقیقی رائے یہی ہے کہ "حقیقی عشق" بالکل بے معنی چیز ہے اور غزل گوئی سے اس کا تعلق نہیں۔"

"دنیا اب اخلاق کے مواعظ سے تنگ آچکی ہے اور اب اسے حقائق کی ضرورت ہے۔

"میرے نزدیک تغزل میں تصوف کو شامل کرلینا ایک غزل گو شاعر کا کمال نہیں بلکہ اس کا عجز ہے۔"

"دنیا میں کسی کتاب کے متعلق یہ گفتگو کرنا کہ وہ اخلاق پر اچھا اثر ڈالتی ہے یا برا لایعنی سی بات ہے اگر کوئی تنقید ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ اچھی لگتی ہے یا بری۔ اس لیے کسی شاعر کے متعلق یہ گفتگو کرنا کہ اس کی شاعری اخلاق کو خراب کردینے والی ہے درست نہیں۔"

غرضیکہ نیاز فتح پوری نہ صرف دو ٹوک انداز میں گفتگو کرتے تھے بلکہ فن کو پرکھنے کے لیے فنی معیار ہی کو ہمہ وقت پیش نظر رکھتے تھے۔ ممکن ہے بعض لوگ سوچیں کہ ادب کو اخلاقیات سے منقطع کردینے والی بات انتہا پسندانہ رویہ ہے اور اس لیے نیاز کا یہ ادبی موقف درست نہیں ہے مگر ایسا سوچنا محض غلط فہمی ہی کے باعث ہوسکتا ہے۔ دراصل نیاز فتح پوری اخلاقیات کے خلاف نہیں تھے۔ ان کا موقف فقط یہ تھا کہ ادب کو اخلاقیات کے میزان پر تولا نہیں جاسکتا کیوں کہ ایک غیر ادبی تحریر بھی اخلاقیات کا پرچار کرسکتی ہے لیکن ادب اگر وہ ادب نہیں تو پھر یہ اخلاقیات کا کتنا ہی بڑا مبلغ کیوں نہ ہو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اگر نیاز اس بات کو اور آگے بڑھاتے تو اخلاقیات کا ایک اور پہلو سامنے آتا جو ادب کو ہمیشہ سے مرغوب رہا ہے۔ وہ یہ کہ ادب جذبات کی تہذیب کرتا ہے اور یوں بالواسطہ طور پر اپنے قاری کو ایک بہتر شہری بننے پر مائل کرتا ہے لہٰذا ادب کا اخلاقیات ...... بہت گہرا تعلق ہے۔ مگر اخلاقیات کو کسی صورت بھی ادب کی میزان قرار نہیں دیا جاسکتا۔ نیاز نے یہ بات اس زمانے میں کہی جب یا تو ادب سے پراپیگنڈہ کا کام لیا جارہا تھا یا اسے محض ذہنی عیاشی کا ایک حربہ تصور کیا جارہا تھا۔ سو اپنے تنقیدی اور فکری موقف کے ضمن میں نیاز فتح پوری مثبت اور صحت مند سوچ رکھتے تھے۔ صحت مند سوچ آج کے جذباتی ماحول میں توازن اور اعتدال کی فضا پیدا کرنے میں حد درجہ ممد ثابت ہوسکتی ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم

علامہ نیاز فتح پوری کی جامعیت و انفرادیت

پہلے تو میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے مجھے موقع دیا کہ میں آپ حضرات کی خدمت میں حاضر ہوکر نیاز صاحب کے بارے میں کچھ عرض کروں۔ اصل میں نیاز صاحب کے بارے میں مختصر وقت میں، یا سیمینار میں کہنا یا بولنا کوئی آسان کام نہیں ہے اس لیے کہ وہ اپنی جگہ پر ایک پوری انسائیکلوپیڈیا تھے۔ وہ انشاپرداز تھے، وہ افسانہ نگار تھے، انھوں نے تنقیدیں کی ہیں، نفسیات اور تاریخ پر مضامین لکھے ہیں، انھوں نے تاریخی کتابیں بھی لکھی ہیں، جنسیات پر مضامین اور کچھ کتابیں مرتب کی ہیں۔ غرض کہ بیشتر موضوعات ایسے ہیں جن کا انھوں نے احاطہ کیا ہے اور جیسا کہ ابھی بعض مقررین نے کہا کہ ان کے کسی بھی موضوع پر لکھے ہوئے مضامین کو پڑھیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص اسی کا اسپیشلسٹ ہے، اسی کا ماہر ہے اور یہ فن اس کا خاص ہے لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ نیاز صاحب صرف اسی فن کے ماہر نہیں ہیں بلکہ بیشتر علوم و فنون کے ماہر ہیں۔

میں یہاں پر صرف نگار کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ نگار اصل میں ۱۹۲۲ء میں نکلنا شروع ہوا تھا اور ہم لوگوں نے جو بہت بعد کی نسل کے لوگ ہیں، نگار کو اس وقت پڑھا جب نگار کا زمانہ شباب نہیں تھا اور نگار کا وہ زور شور باقی نہیں تھا جو پچھلے فائل پڑھنے سے ہمیں محسوس ہوتا ہے۔ اردو صحافت میں نگار کا کیا رول رہا ہے اور اس کا کیا مقام رہا ہے، میں اس سلسلے میں آپ سے دو چار باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے نیاز فتح پوری صاحب کا بڑا کنٹری بیوشن یہ ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کے بہت سے مدیروں کے لیے زندہ رہنا مشکل کردیا تھا۔ اس وقت تصور

یہ تھا کہ اگر آپ اردو اچھی لکھنا جانتے ہیں' اگر اردو لکھنے کا سلیقہ آپ میں ہے تو آپ مدیر بن سکتے ہیں۔ لیکن دو آدمیوں نے ایک تو ہمارے ابوالکلام آزاد اور دوسرے نیاز صاحب نے ایڈیٹر سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ صرف اردو جاننا کسی رسالے کا ایڈیٹر ہونے کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ اسے دوسرے علوم پر بھی اچھی خاصی قدرت ہونی چاہیے اور ان دونوں حضرات کو یہ قدرت حاصل تھی۔ نیاز صاحب نے اپنے پرچے میں جن مختلف موضاعات پر لکھا ہے اگر آپ ان کا شروع سے لے کر آخر تک صرف انڈکس پڑھ لیں تو یقین نہیں آتا کہ ایک آدمی اتنے موضوعات پر لکھ سکتا ہے یا معلومات بھی رکھ سکتا ہے۔ جب وہ ادب میں نقاد کی حیثیت سے لکھتے ہیں' وہ افسانہ نگار کی حیثیت سے لکھتے ہیں' وہ شاعر کی حیثیت سے لکھتے ہیں' وہ محقق کی حیثیت سے لکھتے ہیں' وہ اردو ادب کے بارے میں لکھتے ہیں' وہ فارسی ادب کے بارے میں لکھتے ہیں' وہ ٹیگور کی کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرتے ہیں۔ یعنی صرف آپ ادب ہی۔ لے لیجئے تو میں کہتا ہوں کہ نیاز صاحب اور چیزوں کے بارے میں نہ لکھتے صرف ادب میں ان تمام شعبوں کے بارے ہی میں لکھتے تب بھی ہمیں حیرت ہوتی کہ ایک آدمی اتنے مختلف موضوعات پر ادب کے کیسے لکھ سکتا ہے اور اتنی قدرت اسے کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔

دلی میں ایک مرتبہ فراق صاحب سے گفتگو ہو رہی تھی۔ بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں' نیاز صاحب کا بھی ذکر آگیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب نیاز صاحب کے ہندوستان سے پاکستان چلے جانے پر اختلاف رائے تھا۔ فراق صاحب نے بڑی دلچسپ بات بتائی۔ کہنے لگے کہ جب میں لکھ رہا تھا' نیا نیا شاعر ہوا تھا' میری غزلیں چھپ رہی تھیں لیکن لوگ زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ یہ اہمیت پہلی بار مجھے نیاز صاحب نے دی تھی کہ مجھ پر نگار میں کچھ لکھا تھا' اور میرے بارے میں ایک ایسی رائے کا اظہار کیا تھا کہ لوگوں کی توجہ میری طرف مبذول ہوئی تھی اور اس کے بعد سے ہی ان سے میری اتنی حوصلہ افزائی ہوئی کہ میں فراق بننے لگا' یعنی یہ کام اصل میں نیاز صاحب ہی کا تھا۔

نیاز صاحب دلی تشریف لاتے تھے۔ بہت کم، جب سے ہم نے ہوش سنبھالا تھا دو چار ہی دفعہ آئے ہوں گے۔ ایک دفعہ نیاز صاحب سے گفتگو ہو رہی تھی اور ایک نوجوان کے بارے میں اس کی کتاب پر نگار میں بڑا اچھا تبصرہ چھپا تھا۔ نیاز صاحب نے خود کیا تھا۔ تو ہم نے کہا کہ قبلہ آپ نے ان کی کتاب پر بڑا اچھا تبصرہ کر دیا ہے۔ غالباً وہ کتاب تو اس قابل نہیں تھی تو نیاز صاحب کہنے لگے کہ میں بت شکن ہوں اور جب تک کوئی بت نہ بنے تو میں گراؤں گا کیا اور پھر بعض اوقات تو بت مجھے بنانے پڑتے ہیں۔ تو جب تک واقعی اس میں کوئی جان نہ ہو میں کیا کر سکتا ہوں اور جب تک اس نئے لکھنے والے کی ہمت افزائی نہ کروں وہ اس قابل ہی نہ ہو گا کہ میں اس کے بارے میں کچھ کہہ سکوں۔ اور یہ واقعی ان کا رویہ تھا کہ بیشمار لوگوں کی مطبوعات کے سلسلے میں خود میرے بارے میں میری ایک معمولی سی کتاب چھپی تھی مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط کا ترجمہ اور ایک انگریزی کا ترجمہ جو میں نے ان کی خدمت میں بھیجا تھا۔ مختصر تبصرے تھے۔ آٹھ آٹھ دس دس لائنوں کے جو ان کی عادت تھی، اس میں حوصلہ افزائی کی گئی تھی کہ آپ یقین جانئے کہ اس رات کو جب نگار کا وہ پرچہ ملا تھا جس میں تبصرہ تھا میری کتاب پر، میں رات کو بہت دیر بعد سویا۔ یعنی اس خیال نے کہ نیاز صاحب نے ہماری کتاب کے بارے میں اتنی اچھی رائے کا اظہار کیا ہے، ہمیں جگائے رکھا۔ ظاہر ہے یہ صرف ان کی حوصلہ افزائی تھی جو وہ نوجوانوں کی کرتے تھے۔

آپ نیاز صاحب کے نگار کا پورا مطالعہ کیجئے تو جیسا کہ پہلے میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اس میں معلومات کا جو ذخیرہ ہے اور ہم نے ابھی تک الگ نہیں کیا ہے اور اس کا انتخاب بھی نہیں کیا ہے۔ اس سے بھی آپ کو اندازہ ہوتا کہ انہوں نے کس طریقے سے اس عہد کی عام ضروریات کو صرف نگار سے پورا کیا ہے۔ ابھی ایک مقرر نے "ہمدم" کا ذکر کیا ہے اس کے کچھ فائل مجھے دیکھنے کا موقعہ ملا، ایک کام کے سلسلے میں، لیکن آپ یقین جانئے ہمدم میں وہ بات نہیں ہے۔ الہلال میں وہ بات نہیں تھی، البلاغ میں وہ بات نہیں تھی۔ ان کے میدان محدود تھے۔ کچھ سیاسی میدان تھا، کچھ

مذہبی میدان تھا لیکن ہمارے نیاز صاحب نے تو اپنے لیے کوئی میدان مخصوص کیا ہی نہیں تھا۔ ان کی کوئی حدیں نہیں تھیں۔ نیاز فتح پوری صاحب جنسیات پر کوئی کتاب لکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس علم کا ان سے بڑا کوئی جاننے والا ہی نہیں تھا۔ وہ تاریخ پر کتاب لکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ماہر تاریخ ہیں۔ میں نے ان کی کتاب "بابر سے محمد بن قاسم تک" پڑھی، کتاب پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ کمال کردیا ہے انھوں نے۔ غرض یہ کہ ان کا مطالعہ اور ان کی معلومات غیر معمولی تھیں۔ پھر آپ دیکھیے کہ نگار میں اس زمانے میں جب کہ تنقید کا خاص رجحان تھا جس میں مغرب اور مشرق کے تنقیدی اصولوں کو ملایا جارہا تھا، اگر آپ اس تنقید کا مطالعہ کرنا بھی چاہتے ہیں تو وہ آپ کو نگار سے ملے گی۔ یہ ساری چیزیں آپ کو نگار سے ملیں گی، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے نیاز فتح پوری صاحب کی اہمیت ہمارے سماج میں کیا ہے، ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہیے۔ ادب میں ان کی اہمیت وہ نہیں رہی جو ۱۹۴۷ء سے پہلے تھی یا ۱۹۶۰ء میں یا ۱۹۷۰ء میں تھی، روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے۔ یہ سوال میں نے بار بار اٹھایا ہے۔ حال میں نیاز فتح پوری پر "انجمن ترقی اردو دہلی" نے ایک کتاب چھاپی ہے۔ یہ ڈاکٹر امیر عارفی صاحب کا تھیسس جس کا ذکر ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب نے ابھی کیا ہے۔ اس کی رسم اجراء ادا کی جارہی تھی، جہاں مجھے کچھ بولنے کا موقعہ ملا۔ وہاں بھی میں نے بنیادی سوال یہ کیا کہ کیا نیاز فتح پوری کی معنویت ہمارے زمانے میں ختم ہوگئی ہے۔ کیا اب نیاز فتح پوری ہمارے زمانے میں بے کار و بے سود ہوگئے ہیں، اب ان کی تحریروں کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟ میرے خیال سے ایسا نہیں ہے۔ جس کرائسس کا شکار نیاز فتح پوری ہیں، اس کا شکار ہر فن کار ہوتا ہے، چاہے وہ اول درجے کا ہو چاہے دوم درجے کا ہو۔ وہ کرائسس یا بحران یہ ہے کہ ابھی تک نیاز کی اچھی تحریروں کا انتخاب شائع نہیں ہوا۔ نیاز کی بہترین تحریریں ابھی تک نگار کے فائلوں میں پوشیدہ ہیں۔ پھر یہ میرا خیال ہے ذاتی طور پر کہ ہر فن کار کو ایک نقاد ملتا ہے جو اس کو اس سماج کی نظر سے جس سماج میں وہ نقاد زندہ ہے، اس شاعر کو اس ادیب کو یا اس فنکار کو متعارف کراتا ہے۔

اس نقاد کا فرض ہوتا ہے کہ وہ پہلے جس عہد میں جی رہا ہے' اس عہد کی ضروریات کو محسوس کرے' اس کی عصری آگہی حاصل کرے اور اس عصری آگہی کے مطابق اس فنکار کی چیزوں کو پیش کرے۔ ابھی تک نیاز فتح پوری صاحب کو ایسا نقاد نہیں ملا۔ وہ نقاد جس کو عصری آگہی ہو' وہ نقاد جو نیاز فتح پوری صاحب کی تمام تحریروں پر عبور رکھتا ہو اور وہ نیاز فتح پوری صاحب کی تحریروں کا انتخاب کرکے ہمارے سامنے پیش کرے کہ نیاز زندہ ہیں اور اس زمانے میں نیاز کی معنویت یہ ہے' اس زمانے میں نیاز ہمارے اس کام آسکتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نیاز ہمارے کس کام آسکتے ہیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ نیاز صاحب کی تحریروں کو آپ تین حصوں میں تقسیم کریں' ایک تو وہ جو اخباری تحریریں ہوتی ہیں جو ہر فنکار کے یہاں ملتی ہیں۔ اس طرح کی تحریریں کہ جن کو آپ سمجھتے ہیں کہ یہ وقتی چیزیں ہیں اور آپ ان کو الگ کرسکتے ہیں۔ دوسری قسم کی تحریریں وہ ہیں کہ جن کی اہمیت اردو ادب میں یہ ہے کہ وہ ان کی ارتقائی منزلوں کی نشاندہی کرتی ہیں' جیسے شباب کی سرگزشت جیسے شاعر کا انجام ہے۔ ان کو پڑھ کر آپ کو یہ لگتا ہے کہ یہ وہ وقت ہے کہ جب سجاد حیدر یلدرم اور مہدی افادی' سلطان حیدر جوش کے ساتھ مل کر نثر میں آرائش پیدا کی جارہی ہے۔ نثر میں حسن پیدا کیا جارہا تھا۔ نثر کو سجایا جارہا تھا۔ اس میں رنگینی پیدا کی جارہی تھی۔ جب اس کا ذکر آئے گا تو اس وقت ان چیزوں کا ذکر آئے گا اور یہ چیزیں تاریخ اردو ادب کا اہم ترین حصہ ہیں' لیکن یہ اتنی اہم نہیں جتنی اہم ہماری تیسری طرح کی تحریریں ہیں اور جن کی معنویت آج بھی باقی ہے' جن تحریروں کو پڑھ کر ہم آج بھی بہت کچھ حاصل کرسکتے ہیں۔ ہمیں زندگی میں کچھ حاصل ہوسکتا ہے اور اسے پڑھ کر ہم کچھ سیکھ سکتے ہیں اور ان تحریروں میں مجھ پر جو تاثر ہوتا ہے' بڑا تاثر وہ یہ ہے کہ نیاز فتح پوری نے ہم کو آزادی رائے سکھائی' نیاز فتح پوری نے ہم میں جرات فکر پیدا کی ہے' نیاز فتح پوری نے ہم کو یہ سکھایا ہے کہ آپ پہلے سوچئے' سمجھئے' اپنی رائے بنائیے پھر اسے نافذ کیجئے' غلط یا صحیح۔ چنانچہ آپ نیاز فتح پوری صاحب کی بہت سی تحریریں دیکھئے مذہب کے معاملے میں ظاہر ہے کہ ان میں آپ کو بہت سا اختلاف ہوگا۔ لیکن

ایک اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے محنت کی ہے' انھوں نے تہبند باندھا ہے' انھوں نے بنیان پہنا ہے' وہ پسینے میں شرابور ہوئے ہیں' مادی حالات ان کے خراب رہے ہیں' لیکن انھوں نے کبھی اپنے سماج سے سمجھوتہ نہیں کیا' انھوں نے بڑی بڑی جنگیں لڑی ہیں اور جو کچھ ان کے سمجھ میں آیا ہے چاہے وہ مذہب کے بارے میں ہو چاہے سماجیات کے بارے میں ہو چاہے ادب کے بارے میں ہو چاہے عمرانیات کے بارے میں ہو کسی کے بارے میں ہو' جو بات انھوں نے کہی ہے' حق و صداقت کے ساتھ کہی ہے۔ آپ ان تحریروں کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ بعض حصوں کے بارے میں آپ کو اختلاف ہے۔ بعض فقروں کے بارے میں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ نیاز صاحب غلط کہہ رہے ہیں لیکن آپ نیاز صاحب کے بارے میں شروع سے لے کر آخر تک یہ نہیں کہہ سکتے کہ نیاز صاحب نے کہیں پر بھی کسی آدمی سے' کسی ادارے سے' کسی حکومت سے کوئی سمجھوتہ کیا ہے۔ یہ بات آپ نیاز صاحب کے بارے میں نہیں کہہ سکتے اور یہ ہی اہم بات ہے' یہ ہی قابلیت ہے' یہ ہی معنویت اور اہمیت ہے نیاز صاحب کی ہماری زندگی میں اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب جس طرح نگار نکال رہے ہیں اسی طرح اب وہ اس کام کو بھی سنبھالیں گے۔ یعنی نگار کے فائلوں سے نیاز صاحب کی تحریروں کا انتخاب کریں گے اور جن تحریروں کی ہمارے لیے آج معنویت باقی ہے انھیں شائع کریں گے۔ "

ڈاکٹر سلیم اختر

بنیاد پرستی اور نیاز فتح پوری

آج کی محفل میں شمولیت میرے لیے باعث عزت بھی اور باعث افتخار بھی' کہ شہر قائد کے معزز اہل قلم کے سامنے مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع مل رہا ہے جس کے لیے میں اپنے محترم دوست ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری روشن خیال انسان ہیں اسی لیے انھوں نے نیاز فتح پوری کے حوالہ سے کانفرنسیں' سیمینارز اور کلیدی خطبات کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے کہ اور نہیں تو نیاز فتح پوری جیسی باغی شخصیت کے حوالہ ہی سے کچھ کہنے کی گنجائش نکل آئے۔ جب ڈاکٹر صاحب نے پوچھا' کس موضوع پر مقالہ لکھو گے تو میں نے "بنیاد پرستی اور نیاز فتح پوری" عنوان تجویز کیا' سن کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ نہ صرف یہ موضوع ٹھیک ہے بلکہ آج کی ضرورت بھی ہے کہ اس اہم مسئلہ کے بارے میں لکھا جانا چاہیے۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں بنیاد پرستی کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہ رکھتا تھا' ایسی معلومات جو علمی' تاریخی اور تحقیقی شواہد پر مبنی ہوں۔ کوئی چھ ماہ قبل ویسے ہی کچھ پڑھنا شروع کیا تو موضوع کی وسعت اور مسائل و مباحث میں تنوع کا اندازہ ہوا اور جیسے جیسے مطالعہ بڑھتا گیا میں موضوع میں ڈوبتا گیا اور لکھنا جو شروع کیا تو میں لکھتا ہی چلا گیا حتیٰ کہ سو صفحات کی کتاب تیار ہو گئی۔ آپ حضرات لاکھ اہل علم' اہل دانش اور اہل نگاہ ہوں مگر اتنے گئے گزرے بھی نہیں کہ سو صفحات کی کتاب سنا کر صبر کا امتحان لوں لہٰذا کتاب کے صرف ایک دو نکات عملاً پیش کر رہا ہوں تاکہ بنیاد پرستی کے تناظر میں نیاز فتح پوری کی شخصیت کے اہم اور بعض امور کے لحاظ سے تو رجحان

ساز پہلو کا مطالعہ کیا جاسکے۔ اس اعتراف کے ساتھ کہ اڑھائی ہزار برس کے متنوع رجحانات و میلانات کا خلاصہ پیش کرنا بھی ممکن نہیں کیونکہ مختصر ترین الفاظ میں بات کی گئی ہے اس لیے متعدد مقامات پر آپ حضرات کو تشنگی کا احساس بھی ہو سکتا ہے۔

---

۲۲ جون ۱۶۳۳ء

پوپ اربن ہشتم (اصل نام : مافیو بربرینی - MAFFEO BARBRINI) (URBAN VIII خوش ہوگا کہ آج اس نے بوڑھے گلیلیو گلیلی سے اعتراف گناہ اور توبہ نامہ حاصل کرلینے کے بعد بائبل کی حرمت محفوظ کرکے گویا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ طے کردیا کہ یہ غیر متحرک کرہ ارض مرکز کائنات ہے اور چاند سورج خدام ادب کی مانند اس کے گرد طواف کرتے ہیں۔ گلیلیو' پوپ کا ذاتی دوست تھا اور وہ اس کی صلاحیتوں کا معترف بھی تھا مگر اس ناہنجار کی زبان بندی اس لیے ضروری تھی کہ اگر لادین عناصر کو دوربین جیسے کھلونوں کی مدد سے' آنکھوں پر جادو کی پٹی باندھ کر' ناقابل دید چیز دکھا کر' کھلے عام بائبل کی تعلیمات کے برعکس اور تخلیق کائنات کے ربانی ارشاد کے منافی کافرانہ اور ملحدانہ نظریات پیش کرنے کی اجازت دے دی گئی تو ایک دن ایسا بھی آسکتا ہے جب نہ مسیحیت رہے گی' نہ پوپ' نہ چرچ' نہ پادری۔ یہ محض چاند سورج کی بات نہ تھی !۔ عیسائیت سے وابستہ بنیادی عقائد کا معاملہ تھا۔

یوں دیکھیں تو ۲۲ ر جون ۱۶۳۳ء کے دن سے "فنڈا مینٹل ازم" کی باقاعدہ تاریخ کا آغاز کیا جاسکتا ہے کم از کم یورپ کی حد تک !

صوفیاء نے علم کے تین ذرائع قرار دیے ہیں' علم الیقین' عین الیقین اور حق الیقین --- خارجی شہادت پر کسی امر کا تسلیم کرنا علم الیقین ہے مثلاً کسی معتبر سند پر یہ باور کرلینا کہ فلاں مقام پر آگ لگی ہے۔ اگر اس مقام پر جاکر بچشم خود آگ کا مشاہدہ کریں تو یہ عین الیقین ہوگا جب کہ انگلی جلا کر آگ کا تجربہ کرنا حق الیقین ہے۔ بالفاظ دیگر حصول علم خبر' مشاہدہ اور تجربہ کا مرہون منت ہوتا ہے۔ راہ سلوک کے ان تین مراحل کو سائنسی جستجو پر منطبق کرنے پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سائنس دان علم الیقین پر

تو بالکل بھروسہ نہیں کرتا کہ یہ سائنسی رویہ کی روح کے منافی ہے البتہ دینیات' الٰہیات' مذہبی افکار' ملفوظات وغیرہ کی زیادہ تر اساس اسی پر استوار ہوتی ہے۔

سائنس دان عین الیقین سے آغاز کار کرتے ہوئے خبر کے سند اور مفروضہ کے مسلمہ بن جانے کی توثیق ر تردید ر تکذیب کو سعی کناں ہوتا ہے' جب ہی تو کسی بھی مفروضہ کو اس وقت تک نظریہ کا مقام نہیں ملتا جب تک مشاہدات اور تجربات کی کسوٹی پر اسے اچھی طرح سے پرکھ نہیں لیا جاتا۔ اسی لیے سائنس دان مشاہدہ (عین الیقین) سے تحقیق کا سفر کا آغاز کر کے تجربہ (حق الیقین) کی منزل تک پہنچ کر نتائج کا استخراج کرتا ہے۔

صوفی کا عین الیقین ظاہر کی آنکھ کا تماشا نہیں ہوتا بلکہ وہ باطن کی آنکھ (بصیرت) سے دنیا اور اس کے مظاہر میں وحدت اور کثرت کا کھیل دیکھتا ہے :

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدہ دل وا کرے کوئی

ظاہر کی آنکھ کمزور ہوتی ہے اسی لیے سائنس داں اس کی تقویت کے لیے آلات تیار کرتا ہے جس کی ایک انتہا پر دوربین ہے تو دوسری پر خوردبین' اور پھر ان دو کے درمیان لاتعداد آلات اور تجربہ گاہیں سب عین الیقین کو حق الیقین کے قریب تر کرنے کے لیے تھا۔ اس عمل کی ایک انتہا پر نظریہ اضافیت ہے تو دوسری پر کوانٹم تھیوری !

آج گلیلو اسی لیے اہم ہے کہ اس نے سب سے پہلے ارسطو اور بطلیموس کی سند پر علم الیقین کے برعکس عین الیقین سے حق الیقین تک رسائی کی سعی کی۔

اگر اس تناظر میں دیکھیں تو پھر بنیاد پرستی علم الیقین بمقابلہ عین الیقین قرار پاتی ہے کہ خبر' سند' مسلمات ہی اساس فکر ہوتے ہیں اس لیے عین الیقین ر حق الیقین کی سند علم الیقین تک محدود شخص کے لیے ناقابل تسلیم اور ناقابل یقین ہوتا ہے۔

چرچ اور گلیلو کا جھگڑا دراصل دو منطقی رویوں یعنی استخراجی اور استقرائی کے باعث بھی تھا شاید اسی لیے بعض محققین گلیلو سے سائنسی طریق کار کی ابتدا کرتے

ہوئے اس کا تعلق استقرائی منطق سے جوڑتے ہیں چنانچہ آئزک آسی موف (ISA ASIMOV) کے بقول :

> اس یعنی (گلیلو) کے انقلاب کی بنیاد یہ تھی کہ اس نے استقرائیہ (INDUCTION) کو استخراجیہ (DEDUCTION) پر ایک منطقی طریق کار کے طور پر سائنس میں فوقیت دی۔ فرضی عمومیوں (GENERALIZATION) پر نتائج کی عمارت تعمیر کرنے کی بجائے (ا) جب کہ گلیلو کے معافی نامہ پر تبصرہ کرتے ہوئے "گلیلو" پر اپنے مقالہ میں برٹرینڈرسل نے یہ لکھا :
>
> "گلیلو اور مذہبی منصفوں کے درمیان یہ تصادم محض آزاد خیالی اور ہٹ دھرمی یا سائنس اور مذہب کے درمیان ہی تصادم نہیں تھا بلکہ روح استقرائیہ اور روح استخراجیہ کے مابین بھی تھا۔(۲)

اب تک جو لکھا گیا وہ صرف مغرب کے حوالہ سے تھا کہ خود ہمارا فلسفہ سائنس اور متنوع علوم کا تناظر مغرب ہی سے تشکیل پاتا ہے تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ دیگر تہذیبیں اور معاشرے ایسے بنیاد پرستانہ رویوں سے آزاد ہوں گے۔ مشرق میں ایران' چین' ہندوستان اور مصر کی بڑی تہذیبیں ہو گزری ہیں اور ان سب میں بھی یہ کرداری رویے ملتے ہوں گے۔ ہاں ان کے اظہار کے لیے شاید سائنس نہ ہو مگر سوچنے سمجھنے والے آزاد خیال حضرات ہر عہد میں رہے ہیں لہٰذا تصادم کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور رہی ہوگی اور نہیں تو بتوں کو خدا نہ سمجھنے کے باعث بھی ایسا ہو سکتا ہے یا پھر پجاریوں' پروہتوں اور کاہنوں کے اختیارات کے حوالے سے یا ان رسوم کی بنا پر جو مذہبی نہ ہوتے ہوئے بھی مذہب کا جزو بنا دی جاتیں۔ کہنے کا مطلب ہے کہ وجوہ' مسائل' مباحث' علوم اور طرز فکر میں اختلاف ہو سکتا ہے مگر انسانی معاشرہ سے قدیم اور جدید کی آویزش ختم نہیں ہو سکتی۔ طرز کہن آئین نو سے ہمیشہ برسرپیکار رہی

ہے۔

جہاں تک مسلم معاشرہ کا تعلق ہے تو ہماری دینی شخصیات اور خطیبوں کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے خرد سوزی اور عقل دشمنی کے لیے استدلال بھی قرآن مجید ہی سے حاصل کیا اور اس امر کے باوجود کہ قرآن مجید کی جن آیات میں نماز روزہ کی تلقین کی گئی ان کی تعداد صرف ۱۵۰ ہے جب کہ ۷۵۶ آیات میں زندگی اور اس کے مختلف مظاہر کے مطالعہ اور کرہ ارض اور کائنات پر غور و فکر کی تلقین کی گئی۔ یہ تو تھے غلام جیلانی برق کے اعداد و شمار (۱) جب کہ دمشق یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد اعجاز الخطیب بھی اپنے طور پر اسی نتیجے پر پہنچے تھے کہ جس کا ڈاکٹر عبدالسلام نے پاکستان پلاننگ کمیشن کے اجلاس (منعقدہ ۲۲ جون ۱۹۸۹ء) میں "پاکستان میں سائنس" کے موضوع پر خطبے میں ان الفاظ میں حوالہ دیا ہے:

> "قانون سازی کے متعلق ۲۵۰ آیات کے مقابلے میں قرآن کریم میں ۷۵۰ آیات ---- جو کل قرآن کریم کا آٹھواں حصہ ہیں' اہل ایمان سے یہ کہتی ہیں کہ وہ فطرت کے مطالعے کے لیے کوشاں ہوں' غور کریں' عقل کا بہترین استعمال کریں اور سائنسی عزم کو اپنی معاشرتی زندگی کا لازمی حصہ بنائیں۔" (۲)

ہم ۲۵۰ آیات مقدسہ کے مقرر کردہ اعلیٰ اخلاقی معیار کے مطابق زندگی بسر نہ کر سکتے تھے لہٰذا انھیں فراموش کیا اور علم و عقل کی تلقین کرنے والی ۷۵۶ آیات سے بھی گزرے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی حیات مبارکہ یاد رکھنے کے باوجود یہ امر فراموش کر بیٹھے کہ انھوں نے "ربی زدنی علما" کی دعا مانگی اور پہلی وحی کا آغاز "اقرا" سے ہوا تھا۔

---- یہ کیسے ممکن ہوا؟

مختلف سیاسی' تمدنی' تہذیبی اور فکری اسباب میں سے میری دانست میں ایک عمومی وجہ (کم از کم برصغیر کی حد تک) یہ رہی ہے کہ قرآن مجید کو ترجمہ سے پڑھنے کے بجائے محض تلاوت پر زور دیا جاتا رہا ہے کہ عربی پڑھنے سے ثواب دارین حاصل

ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر ایک مسلمان کی اور کیا بدقسمتی ہوسکتی ہے کہ وہ عمر عزیز کی نصف صدی جس کتاب کے مطالعے میں گزار دیتا ہے اسے مرتے دم تک یہ علم ہی نہیں ہو پاتا کہ میں کیا پڑھتا رہا۔ حسن قرات کے رسیا سامعین یہ نہیں جانتے کہ وہ کس بات پر وجد میں آرہے ہیں۔

ملا، مولوی، مفتی اور فتوی باز یہ سب نام اور حلیے کے اختلاف کے باوجود ہر معاشرہ کے جانے پہچانے کردار بھی ہیں اور مشترکہ کرداری خصائص کے حامل بھی۔ یعنی محافظ عقیدہ ! بحیثیت مجموعی ایسے اصحاب زندگی کی "ہیر" میں کیدو کا کردار ادا کرسکتے ہیں واضح رہے کہ خود کیدو ہیر کا خوشگار نہیں لہٰذا وہ روایتی مفہوم میں ولین نہیں وہ تو خود کو معاشرہ کے مسلمات کا محافظ اور اخلاقی اقدار کا داعی سمجھتا ہے۔ بنیاد پرست معاشرہ کا "کھیل ناٹک" نہیں کہ اپنی دانست میں وہ یہ سب کچھ معاشرہ کی بہبود، سماج کی فلاح اور اخلاقی اقدار کے اثبات کے لئے کرتا ہے۔ ہم اس کا طرز عمل پسند نہ کریں لیکن اس کے خلوص اور نیت پر شبہ نہیں !

اگرچہ ہمارے ہاں بلکہ یوں سمجھئے کہ عالمی سطح پر بنیاد پرستی کی اصطلاح کا آٹھوں دھائی میں زیادہ چرچا ہوا تاہم جہاں تک بنیاد پرستی کا تعلق ہے تو موجود صدی کے آغاز میں شمالی امریکہ میں اس کا باضابطہ آغاز

BAPTISTS , PRESBYTRIANS , METHODISTS ,

DISCIPLES OF CHRIST

جیسے مسیحی مسالک کی اس سعی کی صورت میں ہوتا ہے جس کی رو سے مندرجہ ذیل امور کو لفظی و معنوی طور پر ہر عہد کے لیے ابدی صداقت قرار دے دیا گیا۔

ا۔ بائبل الہا ہے

ب۔ ہر عہد کے لئے ابدی صداقت کی جائے

ج۔ عقیدہ تثلیث

د۔ حضرت عیسیٰ کی بن باپ کی پیدائش

ر۔ تخلیق کائنات کا تصور بائبل ہی درست ہے
س۔ سقوط آدم
ش۔ مصلوب ہوکر مسیح نے تمام انسانوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کردیا۔
ص۔ مصلوب ہوجانے کے بعد حضرت عیسیٰ کے جسمانی حیات اور پھر آسمان کو پرواز۔
ک۔ مسیح کی آسمان سے زمین پر واپسی اور پھر ہزار برس تک دنیا پر حکمرانی۔
گ۔ موت کے بعد سچے عیسائیوں کی حیات نو اور پھر جسمانی وجود کے ساتھ آسمان پر سزا اور جزا حاصل کرنا۔

دراصل انیسویں صدی کے اواخر اور موجودہ صدی کے آغاز میں نئے علمی تصورات، سائنسی انکشافات اور فلسفیانہ افکار مسیحیت کے روایتی تصورات اور بائبل کے لئے بہت بڑا چیلنج ثابت ہورہے تھے۔ تخلیق کائنات کا بائبل کا تصور متروک ہوا اور پھر ڈارون نے انسانی فضیلت اور اشرف المخلوقات ہونے کے احساس تفاخر پر مبنی تصور کو دھچکہ پہنچایا۔ چنانچہ ان سب کا مقابلہ کرنے کے لئے پہلے تو PROPHETIC CONFERENCES کی صورت میں بائبل کی ابدی حقانیت کا اثبات کیا گیا اور پھر اس سلسلہ کو مزید تقویت دینے کے لئے سالانہ بائبل کانفرنسیں کی جاتیں اور دینی تعلیم کے لئے بائبل اسکول قائم کئے گئے۔ اور ان سب پر مستزاد مختلف دانشوروں کو "بدعتی" (HERESY) قرار دینے میں مصروف رہنے والے پادری آزاد خیالی کی بدعتوں اور مسیحیت کے بنیادی عقائد کے تحفظ کے لئے ۱۹۰۹ء ـ ۱۹۱۵ء تک رسالوں کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا جاتا رہا۔ ان رسائل کا مشترکہ عنوان یہ تھا :
"THE FUNDAMENTALS : A TESTIMONY TO THE TRUTH"

بنیاد پرستی کے ضمن میں ۱۹۱۹ء کا سال سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس برس "WORLD CHRISTIAN FUNDAMENTALS" ASSOCIATION کی تشکیل کی گئی۔ اس تنظیم نے آزاد خیال پادریوں کو چرچ سے خارج کیا۔ ہر سطح پر نئے فلسفیانہ تصورات ا[illegible] انکشافات کے خلاف محاذ

قائم کیا گیا' اس حد تک کہ ۱۹۲۵ء میں ریاست ٹینیسی کے سرکاری مدارس میں ڈارون کے نظریہ کی تعلیم ممنوع قرار دے کر ریاست کے ایک قصبہ ڈیٹن (DAYTON) کے سائنس ٹیچر پر اس جرم پر مقدمہ چلایا گیا (یہ مقدمہ SCOPE S CASE کے نام سے مشہور ہے) عدالت نے بنیاد پرستوں کے حق میں فیصلہ دیا۔ اس عہد کے بنیاد پرستوں کا یہ نعرہ تھا :

" EXORCISM OF MODERNISM AND ALL ITS ASSOCIATED DEMONS"

(جدیدیت اور اس سے وابستہ شیاطین کا بھوت اتارنا) عیسائیوں کے ہاں "اوریجنل سن" کے تصور کے باعث جہنم ضروری ہے جس میں گنہگار ڈالے جائیں گے اور اس لئے بھی کہ حضرت عیسیٰ نے صلیب قبول کر کے گنہگاروں کا کفارہ ادا کر دیا جب کہ حضرت عیسیٰ کا جسمانی طور پر ظہور ثانی بھی عیسائیت کے بنیادی عقائد میں شامل ہے نیز اب خود مسیحی ہی اس کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار کر رہے ہیں۔ جنگ لاہور' ۲۰ دسمبر ۱۹۹۳ء میں ڈیلی ٹیلی گراف (لندن) کے حوالہ سے مطبوعہ خبر پیش ہے :

لندن (پی اے) بشپ آف درہم ڈاکٹر ڈیوڈ جینکنز کے متنازع بیان پر پادریوں اور عیسائی حلقوں نے شدید رد عمل کا اظہار کیا ہے۔ ڈیلی ٹیلی گراف کے مطابق ڈاکٹر ڈیوڈ نے ا- بجلکن کانفرنس میں دعویٰ کیا تھا کہ جہنم میں دائمی عذاب نہیں ہوگا اور نہ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ ظہور ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے اس بات پر یقین ہے کہ کوئی دائمی دوزخ نہیں ہے کیونکہ ہمارا خدا اتنا ظالم نہیں ہو سکتا تاہم میرا خیال ہے کہ جن لوگوں نے بخشش کا ہر موقع ضائع کر دیا ہے ان کے لیے نیستی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس بات پر یقین کر لینا ممکن نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ ظہور ہوگا یا دنیا ختم ہو جائے گی۔ ان کے خیالات پر ممتاز پادریوں نے شدید رد عمل کا اظہار کیا ہے۔ بشپ آف ٹیفیلڈ ڈیوڈ مون نے کہا ہے کہ عیسائیت میں یہ بات ضروری نہیں کہ دوزخ کے طبعی عذاب پر یقین کر لیا جائے لیکن یہ بات کہنا بھی درست نہیں ہے کہ دوزخ سرے سے ہے ہی نہیں۔ بشپ آف سوڈور نوئیل جونز نے ڈاکٹر ڈیوڈ پر

الزام لگایا ہے کہ انھوں نے عیسائیت کے بنیادی عقائد کو جھٹلایا ہے۔ حضرت عیسیٰ کا دوبارہ ظہور بنیادی عقیدہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر ڈیوڈ آئندہ سال ریٹائر ہونے والے ہیں۔

جہاں تک بنیاد پرستی کی اصطلاح سے پہلے اس سے وابستہ تصورات کا تعلق ہے تو اردو میں اس مقصد کے لیے راسخ العقیدہ' راسخ اعتقادی' کٹر مذہبیت' ماضی پرستی' قدامت پرستی' عقیدہ پرستی' بے لچک مذہب پرستی' مذہبی جنون' غیر عقلی مذہبیت' رجعت پرستی' اجعت پسندی' روایت پرستی اور مقبول عام ملائیت —— علمی کتابوں میں زیادہ تر راسخ انتقادیت یا راسخ العقیدگی استعمال ہوتی رہی ہیں۔

بنیاد پرست بنیادی طور پر خوفزدہ انسان ہے کہ اسے ہر دم عقیدہ کی بنیادیں ڈانواں ڈول نظر آتی ہیں۔ بنیادیں کس لیے ڈانواں ڈول نظر آتی ہیں ؟ فلسفہ' منطق' سائنس پر مبنی تصورات اور انکشافات سے پہلے مذہب کو کسی نئے مذہب سے خطرہ لاحق ہوتا تھا۔ چنانچہ ہر ممکن طریقہ سے اپنے مذہب و مسلک اور عقیدہ کا دفاع کیا جاتا اور اسی ضمن ہر قسم کا جور و ستم اور تعزیرات روا رکھی جاتیں بلکہ عبرت کے لیے بعض اوقات تو مذہبی تعزیرات عوامی روپ اختیار کر لیتیں۔ تمام مذاہب اسی نوع کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم اور ان کے صحابہ پر اہل مکہ نے جو مظالم روا رکھے وہ ان کے نقطہ نظر کے لحاظ سے درست تھے کہ ان کے باپ دادا کے عقائد کی تکذیب ہو رہی تھی لہٰذا اپنے خداؤں (بتوں) کے تحفظ میں ابوجہل (اصل نام : عمر بن ہشام) ابولہب اور راہ رسولؐ میں کانٹے بکھیرنے والی اس کی بیوی جمیلہ آج کی اصطلاح میں بنیاد پرست قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ یوں دیکھیں تو موسیٰ کے مقابلہ میں فرعون' حضرت عیسیٰ کو صلیب دینے والے یہودی' جادوگرنیوں کو زندہ جلانے والے پادری' منصور حلاج کا مثلہ کرنے والے' سقراط کو زہر پلانے والے' مارٹن لوتھر کے مقابلہ میں پوپ' مسلمانوں کے مقابلہ میں مندر کار کھوالا بجاری اور بابری مسجد گرا کر رام مندر تعمیر کرنے والا بال ٹھاکرے۔ الغرض نام اور مقام میں فرق ہو سکتا ہے' کام میں نہیں کہ :

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں !

جہاں تک برصغیر میں بنیاد پرستی کا تعلق ہے تو شاید پہلی مسلم حکومت کے قیام کے ساتھ ہی اس کا آغاز بھی ہوگیا ہوگا۔ اچھے' برے' روشن خیال' تنگ نظر' مدبر اور غیر مدبر بادشاہوں کے لحاظ سے اگرچہ صورت حال میں تغیرات آتے رہتے ہوں گے تاہم مذہبی شخصیات میں سے کم از کم ایک طبقہ ایسا ضرور رہا ہے جو غیر مسلموں کو کافر سمجھ کر ان سے وہی سلوک روا رکھنے کا قائل تھا جو کفار کے ساتھ روا رکھا جانا چاہیے اگرچہ اس انداز کا بالعموم معاصر تواریخ میں زیادہ مواد نہیں ملتا۔ اسلامی عقائد اور ہندو دھرم کے درمیان اگر کوئی چپقلش تھی تو اس کی نوعیت کیا تھی ؟ ان دونوں مذاہب میں بنیادی نوعیت کے اتنے اختلافات ہیں کہ تصادم ناگزیر ہوگا۔ صرف گاؤ کشی کو لے لیں جو ہمیشہ سے باعث نفاق رہی ہے البتہ صوفیاء ان جھگڑوں سے لاتعلق رہ کر درس محبت عام کرتے رہے اور ان ہی کی میٹھی شخصیت کے زیر اثر لوگ مسلمان ہوتے گئے۔ ادھر بادشاہوں نے حکومت چلانی تھی اور وہ کاروبار مملکت سے ہندوؤں کو یکسر خارج نہ کرسکتے تھے۔

"صحیفہ نعت محمدی" کے مولف کے بموجب سلطان شمس الدین التمش کے پاس دھلی کے چند علمائے دین کے ایک وفد نے آکر کہا۔ "کہ ہندوؤں کے ساتھ "اما القتل و اما الاسلام" "کا طریقہ اختیار کیا جائے" بادشاہ نے وزیر نظام الملک جنیدی سے کہا کہ وہ ان علماء سے بات کرکے انھیں مطمئن کرے۔ وزیر باتدبیر نے اپنے دلائل سے انھیں یہ کام موخر کرنے پر رضامند کرلیا" (۱)

تحقیق سے اسی انداز کی مزید مثالیں بھی تلاش کی جاسکتی ہیں۔ دراصل یہاں کے بادشاہ مسلمان تو تھے لیکن اتنے اسلامی نہ تھے کہ علماء کے کہنے پر مقامی آبادی کا قتل عام شروع کردیتے۔ وہ جانتے تھے کہ مقامی آبادی کے تعاون کے بغیر مستحکم حکومت قائم نہیں کی جاسکتی۔

قاضی جاوید "ہندی مسلم تہذیب" میں لکھتے ہیں کہ "یہ سلطان محمد تغلق تھا جس کے زمانے میں نصاب تعلیم میں معقولات کا پلہ بھاری [illegible] شروع ہوا' عجیب و غریب

شخصیت کے حامل اس بادشاہ کو نثری علوم سے بہت شغف تھا۔ اس کے زمانے میں ہندوستان میں ایسے علماء موجود تھے جو علوم نقلیہ کے علاوہ عقلی علوم سے بھی دلچسپی رکھتے تھے .... اس زمانے میں بہمنی سلطنت میں بھی معقولات کو فروغ حاصل ہو رہا تھا ... سلطان تغلق کے بعد سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں معقولات کو زبردست ترقی حاصل ہوئی .... لودھیوں کے بعد جب عنان حکومت مغلوں کے ہاتھ میں آئی تو اس رجحان کو مزید ترقی ملی۔ ہمایوں کو ریاضی' ہندسہ' نجوم اور ہیت جیسے علوم سے دلچسپی تھی اور یہ سب اس زمانے میں عقلی علوم شمار ہوتے تھے جب کہ اکبر اعظم کا دور آیا تو گویا معقولات کے سنہری دن آ گئے۔" (ص ۱۱۱ ۔ ۱۰۹)

مغل حکمرانوں نے تو اسی اصول کو مغل سلطنت کی بنیادی پالیسی میں تبدیل کر دیا جس کی نمایاں ترین مثال ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر (پیدائش امر کوٹ : ۱۵ اکتوبر ۴۲ ۱۵ء ۔ وفات آگرہ : ۱۶ اکتوبر ۱۶۰۵ء) کا دین الٰہی (آغاز : ۱۵۸۱ء) ہندو اور راجپوت خاندانوں سے سلسلہ مناکحت اور گاؤ کشی پر پابندی جیسے احکام تھے۔

اکبر ذہین' مدبر اور دور اندیش حکمران تھا۔ وہ ہندو سائیکی کو خوب سمجھتا تھا یعنی ہندو سپاہی مغل پرچم تلے جان تو دے سکتا ہے مگر مسلمان کو گائے کا گوشت کھاتے نہیں دیکھ سکتا۔ مسلمان اور ہندو جگری دوست ہوتے ہوئے بھی ایک برتن میں پانی نہیں پی سکتے۔ اسی لیے اس نے ہر سطح پر مذہبی آویزش ختم کرنے کے لیے ایسے احکام جاری کیے جنھیں علماء نے بطور خاص ناپسند کیا۔ دین الٰہی کا شاید کوئی سیاسی فائدہ ہوا ہو مگر عام مسلمانوں اور علماء کے لیے تو یہ اسلام میں تحریف کے مترادف تھا اور اسی پر احتجاج بھی ہوا۔ اسی ضمن میں سید محمد جونپوری' شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور خواجہ باقی باللہ کے اسماء قابل ہیں مگر سب سے بلند اور موثر صدائے احتجاج شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی تھی۔ چنانچہ اسلام کے بنیادی عقائد کے تحفظ کے نقطہ نظر سے احتجاج کرنے والے حضرات سے اسی خطہ میں اسلامی بنیاد پرستی کا آغاز سمجھا جا سکتا ہے اور اگر قطعی تاریخ کا تعین مقصود ہو تو پھر دین الٰہی کے آغاز یعنی ۱۵۸۱ء سے اس کی شروعات سمجھی جا سکتی ہیں۔

اس ضمن میں یہ بھی واضح رہے کہ اکبر سے پہلے سلطان علاء الدین خلجی کے ذہن میں یہ سوال سماگیا کہ آنحضرتؐ کے چار صحابہ کی مانند وہ بھی اپنے چار مقربان خاص یعنی الغ خاں، ملک نصرت خاں، ہزالپ خاں اور ظفر خاں کی مدد سے نئے دین کی بنیاد رکھ سکے تاکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مانند اس کا اور اس کے "صحابہ" کا نام ہمیشہ زندہ رہے مگر عماد الملک کوتوال دھلی کے سمجھانے سے باز رہا۔ ضیاء الدین برنی کی "تاریخ فیروز شاہی" میں اس کی تفصیلی ملتی ہے، اور خلجی سے بھی پہلے تیمور نے قرآن مجید میں تحریف کا ارادہ کرلیا تھا اور علماء بڑی مشکل سے اسے اس ارادہ سے باز رکھنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

سولھویں صدی کی مذہبی اور علمی روح کا شیخ احمد سرہندی کے مغل امیر شیخ فرید کے نام اس مکتوب سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے :

> "پس اسلام کی عزت کفر اور کافروں کی خواری میں ہے جس نے اہل کفر کو عزیز رکھا اس نے اہل اسلام کو خوار کیا۔ ان کے عزیز رکھنے سے فقط تعظیم کرنا اور بلند بٹھانا ہی نہیں بلکہ اپنی مجلس میں جگہ دینا اور ان سے ہم نشینی کرنا اور ان کے ساتھ گفتگو کرنا سب اعزاز میں داخل ہے۔ کتوں کی طرح ان کو دور رکھنا چاہیے اور اگر دنیاوی غرض ان سے متعلق ہوں جو ان کے بغیر حاصل نہ ہوتی ہوں تو پھر بے اعتباری کے طریق کو مد نظر رکھ کر بقدر ضرورت ان کے ساتھ میل جول رکھنا چاہیے اور کمال اسلام تو یہ ہے کہ اس دنیاوی غرض سے بھی درگزر کریں اور ان کی طرف نہ جائیں۔" (١)

ان حضرات نے فلسفہ، منطق اور علوم کے بارے میں جو معاندانہ رویہ اپنا رکھا تھا وہ چودھویں اور پندرھویں صدی کے پادریوں کے رویہ سے مشابہہ نظر آتا ہے۔ شیخ محمد اکرام نے "رود کوثر" (ص ١٧٠) میں شیخ احمد ہندی کے جو مکاتیب درج کیے ہیں ان میں سے ایک میں فلسفی کو "شیطان کے گروہ" میں شامل کرتے ہوئے یہ لکھا :

"بعض لوگوں نے جو علوم فلسفہ سے تعلق رکھتے ہیں اور فلسفی تسویلات پر فریفتہ ہیں ان کو حکماء جان کر انبیاء علیہم الصلوۃ و السلام کے برابر سمجھتے ہیں ..... ان علوم کی تصدیق سے انبیاء اور ان کے علوم کی تکذیب لازم آتی ہے کیونکہ یہ دونوں علم ایک دوسرے کے نقیض ہیں اب جو چاہے انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے مذہب کو لازم پکڑے اور اللہ تعالیٰ کے گروہ میں شامل ہوجائے اور چاہے تو فلسفی بن جائے اور شیطان کے گروہ میں داخل ہوجائے۔"

شیخ احمد سرہندی اس ضمن میں مزید فرماتے ہیں :

"یہ لوگ (یعنی فلسفی) بہت ہی بے خود اور بے وقوف ہیں اور ان سے زیادہ کمینہ اور بے وقوف احمق وہ شخص ہے جو ان کو دانا اور عقل مند جانتا ہے۔ ان کے منظم اور مرتبہ علوم میں ایک علم ہندسہ ہے جو محض لایعنی اور بے ہودہ اور لاطائل ہے بھلا مثلث کے تین زاویہ قائمہ کے ساتھ برابر ہونا کس کام آئے گا۔"

ضیاء الدین برنی کے بموجب سلطان التمش کو اس عہد کے مشہور عالم دین مبارک غزنوی نے یہ مشورہ دیا تھا :

"فلاسفہ، علوم فلاسفہ اور معقولات فلاسفہ پر اعتقاد رکھنے والوں کو اپنی سلطنت میں نہ رہنے دیں اور جس طرح بھی ممکن ہو علوم فلسفہ کی تعلیم نہ ہونے دیں۔"

جب کہ شاہ ولی اللہ کی وصیت کی رو سے :

" فارسی و ہندی کی کتابیں، علم شعر، معقولات، اسی سلسلہ کی جو دوسری چیزیں پیدا ہوگئی ہیں ان میں مشغول ہونا اور تاریخ۔ بادشاہوں کی سرگزشتوں اور صحابہ کے باہمی نزاعات کا مطالعہ کرنا گمراہی در گمراہی ہے۔"

اگرچہ امام غزالیؒ نے فلسفہ میں خصوصی شہرت حاصل کی، اتنی کہ یہی وجہ شہرت

بنی مگر یہ مخالفت اس لئے تھی کہ ان کی دانست میں یونانی فلسفہ' اسلامی افکار کے بارے میں شکوک پیدا کرکے عقائد میں ضعف کا باعث بنے گا لیکن اس کے باوجود وہ علوم کی اہمیت کے قائل تھے۔ بقول :

> "وہ شخص جو یہ سمجھتا ہے کہ اسلام کی مدافعت ریاضی کے علوم سے انکار کرکے کی جاسکتی ہے وہ مذہب کے خلاف ایک ناقابل معافی جرم کررہا ہے کیونکہ ان علوم میں کوئی ایسی شے نہیں ہے جو دینی صداقت کے منافی ہو۔"

بنیاد پرست ـــــ اساسی طور پر ماضی پرست ہوتا ہے اس لئے اقبال کے الفاظ میں ... آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا۔ اس کا وظیفہ حیات ہوتا ہے۔ اب زندگی تبدیلیوں کا نام ہے' معاشرہ میں کسی نہ کسی سطح پر یہ تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی اور اپنے اثرات کا مظاہرہ کرتی رہتی ہیں' ایک انتہا پر نظریات اور تصورات تو دوسری طرف انتہا پر نت نئی ایجادات اور اشیا اور ان کے درمیان متنوع نوعیت کی دیگر تبدیلیاں۔ نظریات اور تصورات تو خیر علمی ہوتے ہیں اور ان کے بارے میں ردعمل بھی علمی سطح پر ہوتا ہے یا ہونا چاہیے مگر ایجادات اور عام اشیاء کے بارے میں بظاہر تو کسی بحث کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے' پسند ہے تو استعمال کریں' ناپسند ہے تو مت کریں۔ یعنی یہ قانونی یا مذہبی یا اخلاقی مسئلہ نہیں ہوتا مگر ہمارے ہاں اسے بھی مذہب کے نام پر متنازعہ بناکر ـــ ان کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کے بحث چھیڑ دی جاتی ہے۔ ہمارے مذہبی محققین' دینی شخصیات اور علماء وقتاً فوقتاً جن اشیا کو غیر شرعی اور غیر اسلامی قرار دیتے رہے ہیں ان کی فہرست اگرچہ خاصی طویل ہے تاہم نمونہ کلام پیش ہے۔

ریل گاڑی میں سفر' موٹر سائیکل چلانا' ڈاک سے چٹھیاں بھیجنا یا منی آرڈر سے رقم کی ترسیل' انگریزی ہیٹ پہننا' کیمرہ سے تصویر اتروانا' پتنگ اڑانا' فٹ بال مکروہ ہے (کہ نیکر پہن کر کھیلا جاتا ہے)' جس گھر میں کتا ہو وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے' بلیوں کو مت مارو (کہ ابو ہریرہ کی پسندیدہ تھیں)' پرندوں اور دیگر جانداروں کی تصویر کشی (کہ روز محشر ان میں جان ڈالنے کو کہا جائے گا) عید کی نماز عیدگاہ کے علاوہ

دیگر مساجد میں جائز ہے یا نہیں' ریڈیو سے تلاوت کرنا یا سننا حرام ہے' بنک میں پیسے رکھنا' ہسپتال میں مریضہ کا داخلہ اور عورت کا مرد ڈاکٹر کو نبض دکھانا' انگریزی طرز کے بال کٹوانا' انگریزی ٹوپی کا استعمال۔ اسی انداز کی مزید مثالوں کے لئے فتاوی دارالعلوم اور فتاوی رشیدیہ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

ہمارے زمانے میں برگر' وی سی آر' ڈش انٹینا اور مریض کی جان بچانے کے لئے اعضاء کا عطیہ حرام قرار دیے جاچکے ہیں جب کہ ڈاکٹر اسرار احمد کے بموجب عید پر سویاں کھانا اور معانقہ ناپسندیدہ ہیں' ڈاکٹر موصوف نے اپنے ٹیلی ویژن پروگرام میں عورتوں کو شرکت کی اجازت نہ دی تھی جب کہ مفتی نعیمی صاحب نے تو اصغر ندیم سید کے پی ٹی وی ڈرامہ "دریا" میں طلاق کا منظر دیکھ کر حقیقی زندگی کے میاں بیوی عثمان پیرزادہ اور ثمینہ پیرزادہ کی طلاق کا فتوی جاری کردیا تھا۔

دینی حلقوں میں لاؤڈ اسپیکر خاصی دیر تک زیر عتاب رہا' ڈاکٹر جمیل جالبی نے "پاکستانی کلچر" (ص ۱۸۸) میں مفتی محمد شفیع کی "آلات جدیدیہ کے شرعی احکام" کے حوالہ سے یہ نقل کیا ہے:

> "آلہ مکبر الصوت کا استعمال نمازوں میں درست نہیں اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ سادہ طریقہ مسنونہ کے ساتھ بڑی جماعتوں میں مکبرین کے ذریعہ تکبیرات انتقالیہ کی آواز آخری صفوں تک پہنچائی جائیں یہی جامع خیرات و برکات اور مفاسد سے پاک طریقہ ہے اسی کو اختیار کرنا چاہیے"

اصغر علی گھرال کے بموجب "امرتسر میں مسجد خیردین غالبا پہلی مسجد تھی جہاں لاؤڈ اسپیکر نصب ہوا مگر ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں اسکے خلاف زبردست ہیجان تھا" (مضمون بعنوان "چند پرانے اعتقادات" مطبوعہ "روشن خیال" کراچی جلد۱۔ شمارہ۴)

اصغر علی گھرال نے البتہ یہ نہیں بتایا کہ یہ کس سال میں ہوا تھا۔ جب ایک مرتبہ لاؤڈ اسپیکر کے معاملہ میں ملا کی جھجک کھل گئی تو لاؤڈ اسپیکر سے ایسی انسیت ہوئی کہ اب اس کے بغیر رہا نہیں جاتا۔ اے کاش! وہ پھر پہلے کی مانند لاؤڈ اسپیکر کو حرام

قرار دے دے تو کتنا اچھا ہو!

تو یہ ہے وہ تناظر جس میں نیاز فتح پوری کی مذہب سے مبینہ بغاوت کا مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ آغاز محب عارفی کی نظم "دشمنان نیاز سے خطاب" کے چند اشعار سے کیا جارہا ہے:

ہونے لگے آزادی گفتار کے چرچے
تحریر میں پائے گئے الحاد کے آثار

جو دیکھ رہا ہوں اسے لاتا ہوں زباں پر
اس بات پہ بگڑے ہیں قدامت کے پرستار

اس دین کے پردے میں نہاں اور بھی کچھ ہے
جو ذہن نہیں وہم کی لعنت میں گرفتار

اے متقی دین کیا اسے پرکھا بھی ہے تو نے
جس شخص کو کہا ہے غلط بین و سیاہ کار

نیاز کے مکاتیب سے چند اقتباسات:

"مولوی ایک مسلمان کو کافر و ملحد بنادیتے ہیں۔ کبھی ہندوؤں کی طرف سے بھی کسی کو اپنی جماعت سے خارج کرکے غیر ہندو ہونے کا اعلان کیا جاتا ہے؟ اگر خدا کا اعتقاد ناگزیر ہے تو نوع انسانی میں تفریق مذہب و مسلک کا خیال؟ اتنی بڑی توہین خدائی ہے کہ شاید ہی اس کو معاف کیا جاسکے۔"

"گناہ کرتے ہو تو گناہ کرنے والوں کی سی صورت بناؤ اس سے کیا فائدہ کہ مسجد میں سجدہ کرکے جو خاک اپنی پیشانی پر اٹھاؤ اسے کسی آنچل سے صاف کرتے پھرو۔ اس میں شک نہیں کہ عبادت کا یہ ڈھنگ کسی کو آجائے تو دنیا میں اس سے زیادہ لذیذ

مشغلہ کیا ہو سکتا ہے۔"

"اگر یہ کہوں کہ بیس مرتبہ ابدال کی خدمت میرے سپرد کی گئی اور میں نے انکار کردیا تو اس کا یقین اور بھی تمہیں نہ آئے گا کہ کجا یہ گنہگار اور کجا یہ سعادت۔ اس لیے تمہیں حقیقت کا یقین کیوں کر دلاؤں کہ رفع حجاب اور ابدالیت کا ذکر ہی کیا' منزل قطبیت سے بھی گزر کر ایک خاص درجے پر فائز ہوں اور بغیر کسی واسطے کے براہ راست انوار ربانی سے معاملہ رکھتا ہوں۔"

"قیامت میں مجھے تماشا بننا منظور نہیں کہ پل صراط سے بکرے کی پیٹھ پر سوار گزر رہا ہوں اور لوگ پیچھے تالیاں پیٹ رہے ہیں لیکن چونکہ نشاط قومی قائم رکھنے کے لیے ایسے تہواروں کا قائل ہوں جن میں روز کی بے آب و رنگ زندگی سے ہٹ کر چند ساعتیں چہل پہل میں گزر جائیں اسی لئے یہ گناہ کرلیتا ہوں"

"میرا معاملہ خدا کے ساتھ ہمیشہ اسی طرح رہا ہے اور رہے گا۔ وہ کبھی مجھے چین سے رہنے نہ دے گا اور میں بھی کبھی شکایت نہ کروں گا۔ تمنائیں بہت محدود رکھتا ہوں۔ نہ فقر و فاقے سے ڈرتا ہوں نہ آزار جسمانی سے' ہمت مردانہ نہ سہی لیکن صبر درویشانہ ضرور رکھتا ہوں۔"

جہاں تک نیاز فتح پوری کی ملا دشمنی یا آج کی اصطلاح میں بنیاد رستی کے خلاف رد عمل کا تعلق ہے تو یہ سطحی یا جذباتی ہونے کے برعکس حریت فکر اور خرد افروزی کی اس روایت سے پیوست ہے جس کی شروعات سر سید احمد خاں کی عقلیت کی تحریک اور اس کے نتیجہ میں مذہب کو عقلی معیار پر پرکھے

سے ہوتی ہیں۔ "مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ" "من و یزداں" اور "نگار" میں مطبوعہ متعدد مقالات، استفسارات کے جوابات اور مکاتیب میں ظاہر کیے گئے خیالات سے نیاز کی ملا ناپسندی، خرد پسندی اور حریت فکر کا موزیک تیار ہو جاتا ہے ایسا موزیک جس کی تشکیل میں نیاز کی تخلیقی شخصیت کے جملہ عناصر نے بھرپور کردار ادا کیا۔

نیاز کی مذہبی بغاوت کے ضمن میں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ وہ رومانیت کا علم بردار تھا۔ نیاز، یلدرم اور اختر شیرانی کی رومانیت کا ورڈزورتھ اور کولرج کی رومانیت سے کتنا تعلق تھا یہ جداگانہ بحث ہے جس میں الجھنے کا یہ موقع نہیں۔ رومانیت کی تعریف اور اس کی حدود و امکانات سے وابستہ فکر و نظر کے مباحث چھیڑے بغیر صرف اتنا اشارہ کیا جاسکتا ہے کہ رومانیت کا جزو عظیم "دھر آشوبی" قرار دیا جاسکتا ہے۔ تخیل کی آزاد اڑان اس میں رنگ آمیزی کرتی ہے تو جذبات و احساسات اور ہیجانات اس کی آبیاری کرتے ہیں اور اس سے رومانی کی تخلیقی جمالیات تیار ہوتی ہے (عام تصور کے برعکس اسلوب کی حسن کاری کا رومانیت کے برعکس جمالیات سے تعلق بنتا ہے)۔

نیاز نے غلام ہندوستان کے یبوست زدہ، ذہنی پسماندہ اور غیر تخلیقی مسلم معاشرہ میں آنکھ کھولی تو عام لوگوں کی مانند نیاز کو بھی ورثہ میں کٹرمذہب، خرد دشمنی کورانہ تقلید ارر اندھی روایت پرستی یعنی ہر وہ منفی رجحان جو کسی بھی جامد اور غیر تخلیقی عہد کی اساس ہوا کرتا ہے۔

نیاز نے "والد مرحوم میں اور نگار" میں اپنے بچپن اور مذہبی تعلیم کا جو احوال قلم بند کیا اس سے بخوبی یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ متجسس ذہن کا حامل "PRECOSCIOUS" طالب علم تھا اس لیے وہ سوال کرتا تھا اور سوال کے ضمن میں یہ امر اجاگر کرنے کی ضرورت تو نہ ہونی چاہیے کہ تشکیک پسند ہی سوال کرسکتا ہے۔ بعد ازاں یہی رویہ پختہ ہوکر عدم مصالحت پسندی (NONCONFORMISM) کے رجحان میں تبدیل ہوجاتا ہے جس کا اظہار روایت شکنی، مسلمات سے انحراف اور ٹیبوز سے مزاحمت کی صورت میں ظاہر ہوتا

ہے۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
تو ہو اگر کم عیار میں ہوں اگر کم عیار

سب اسی رویہ کے تخلیقی مظاہر ہیں۔ ایسا شخص بت تراش کے برعکس بت شکن اور استعارہ فروش کے بجائے استعارہ ساز ہوتا ہے۔

نیاز فتح پوری انسا ئیکلوپیڈیک ذہن کے حامل تھے جس کا اندازہ ان کی کتابیات سے ہی ہوجاتا ہے۔ اس پر مستزاد نیاز کا بیک وقت تخلیق کار، مفکر اور محقق ہونا۔ شاعرانہ جذبات پرستی اور چشم حسن شناس نے مزاج سہ آتشہ بنادیا جب کہ عقلی استدلال نے ذہن میں انتخاب کا کڑا معیار پیدا کر رکھا تھا۔ اسلوب اعصاب عاشقانہ، انداز زیست شاعرانہ، زاویہ فکر عاقلانہ ـــــ گویا "قلب او شاعر دماغش کا فراست" والی بات ہوگئی۔

۱۲ سالہ نیاز نے دینی مدرسہ کا جو ماحول دیکھا اور حفظ قرآن کے جس ظالمانہ طریقہ کا مشاہدہ کیا اس نے کم عمری میں نیاز کی ایسی کنڈیشننگ کردی کہ وہ کاروبار ملائیت سے الرجک ہوگئے۔ وہ لکھتے ہیں :

> "اس کم سنی میں بار بار سوچا کرتا تھا کہ اگر عبادت اور مذہبی تعلیم کا صحیح نتیجہ یہی ہے تو مذہب و مذہبیت کوئی معقول بات نہیں۔ دوسری چیز جس نے مجھے مذہبیت کی طرف سے بددل کیا اس مدرسہ کا حافظ خانہ تھا۔ یہ بڑا قدیم مذہبی ادارہ تھا جس میں طلبہ کو قرآن حفظ کرایا جاتا تھا اور اس بے دردی کے ساتھ کہ اس کے خیال سے میرے رونگٹے اب بھی کھڑے ہوجاتے ہیں۔ یہاں جو عذاب بچوں پر نازل ہوا کرتا تھا اس سے میں کیا شہر کا ہر شخص واقف تھا۔ صبح سے دوپہر تک حافظ خانہ کی چیخ و پکار اور

بچوں کی آہ و بکا سے مجھے سخت تکلیف پہنچتی تھی۔ کبھی کبھی میں
والد سے کہہ دیا کرتا تھا کہ اگر قرآن کا حفظ کرانا اس حد تک
ضروری ہے کہ بچہ کا جسم و دماغ دونوں کو مجروح و بیکار کردیا
جائے تو قرآن سے انکار ہی بہتر ہے ... بہر حال مدرسہ اسلامیہ
میں مولانا نور محمد صاحب کی سخت گیری، تشدت اور حافظ خانہ ...
کے وجود نے جو بالکل ایک مذبح کی حیثیت رکھتا تھا میرے اندر
مذہب کی طرف سے ایک خاص کیفیت احتراز پیدا کردی تھی اور
میں سوچا کرتا تھا کہ اگر اسلام یہی ذہنیت پیدا کرتا ہے تو یہ کوئی
معقول مذہب نہیں۔"

مجاز مرسل کی متعدد صورتوں میں سے ایک صورت وہ ہوتی ہے جس میں جزو سے کل مراد لی جاتی ہے۔ یہاں نیاز کا ذہن بھی اس اصول پر کام کررہا ہے کہ ملائیت (جزو) نے مذہب (کل) سے باغی کردیا۔ نیاز کے لیے مدرسہ کے ناموافق ماحول کی کنڈیشننگ عمر بھر برقرار رہی۔ برقرار کیا رہی مطالعہ کے ساتھ پختگی اختیار کرتی گئی اور جن مذہبی اساتذہ کا وہ بچپن میں کچھ نہ بگاڑ سکا بڑا ہو کر ان کی نشانی یا علامت بننے والے مذہبی رویوں اور شخصیات سے منحرف ہوگیا۔ اگر آپ حضرات اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ نیاز کی دینی تعلیم کا زمانہ (۱۸۹۸ء) ایک صدی قبل کے ماحول میں تھا اور آج صدی بعد صورت حال بدل چکی ہے تو ایسا ہرگز نہیں۔ ہم مسلمان ان معاملات میں کبھی بھی نہیں سدھر سکتے ہیں۔ روزنامہ جنگ (لاہور : ۱۳ / نومبر ۱۹۸۳ء) کی یہ منہ بولتی خبر ملاحظہ کیجئے جس کی سرخی ہے : "پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر تعلیم دینا اسلام کے عین مطابق ہے ... قاری عبدالعزیز کا دعوی"

کوٹلی (جام نگر) کے نامہ نگار کے الفاظ میں "پاؤں میں بیڑیاں
ڈال کر دینی تعلیم دینا اسلام کے عین مطابق ہے۔ یہ موقف چاند
مدرسہ تجوید القرآن دریا خاں کے قاری نے ایک اشتہار کے
ذریعہ پیش کیا ہے۔ اشتہار میں کہا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن

عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے غلام حضرت عکرمہ مشہور علماء میں ہیں کہتے ہیں کہ میرے آقا حضرت عبداللہ بن عباس نے قرآن و حدیث اور شریعت کے احکام پڑھانے کے لیے میرے پاؤں میں بیڑی ڈال دی تھی کہ کہیں آؤں جاؤں نہیں۔ وہ مجھے قرآن شریف پڑھاتے اور حدیث پڑھاتے۔ حقیقت میں پڑھنا اسی صورت میں ہوسکتا ہے۔ دریں اثنا معلوم ہوا ہے کہ مدرسہ ہذا میں جن طلبہ کو دینی تعلیم کے لیے داخل کیا جاتا ہے ان کے والدین یا سرپرستوں سے ایک پرنٹ شدہ فارم پر دستخط کرائے جاتے ہیں۔ فارم پر چھپا ہوا ہے کہ میرا لڑکا دوسری جگہ تعلیم حاصل نہ کرسکا اور گھر میں زر نقد اور جو کچھ ہاتھ لگتا ہے چوری کرکے خورد برد کرلیتا ہے میں اسے قرآن مجید حفظ کرانا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے ایسے لڑکوں کا انتظام مدرسہ تجوید القرآن جامع مسجد گلزار دریا خاں میں ہے۔ میں لڑکے کو لے کر آنجناب کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ التماس کرتا ہوں کہ اسے زنجیر لگاؤ۔ زنجیر اور تالوں کی قیمت میں خود ادا کروں گا تاکہ میرا بچہ کہیں بھاگ نہ سکے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ اگر میں اپنے لڑکے کو تاختم قرآن رخصت پر لے جاؤں تو زر ضمانت مبلغ ایک ہزار روپے قاری عبدالعزیز کے پاس رکھوں گا اور جب رخصت سے واپس پہنچوں گا تو زر ضمانت واپس لوں گا۔ اگر لڑکا بھاگ گیا تو اسے واپس پکڑلاؤں گا اور اگر واپس نہ آیا تو قاری صاحب کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ زر ضمانت اور سامان ضبط کرلیں۔

یاد رہے کہ گزشتہ دنوں اس دینی مدرسہ کے دو طلبا بیڑیاں کاٹ کر ان بیڑیوں سمیت سپرنٹنڈنٹ پولیس بھکر کے روبرو پیش

ہوئے تھے۔ انھوں نے مدرس پر انھیں اور ان کے علاوہ بہت
سے طلبا کو حبس بے جا میں رکھنے کا الزام لگایا تھا۔ انھوں نے
مزید زیادتیوں کا بھی ذکر کرتے مدرس کے خلاف حدود آرڈیننس
کے تحت کارروائی کا مطالبہ کیا تھا جس پر سپرنٹنڈنٹ پولیس نے
ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو تحقیقاتی آفیسر مقرر کیا تھا جس پر مدرسہ
کے قاری نے مندرجہ بالا وضاحتیں کیں۔ یاد رہے کہ اس
مدرسہ میں طلبہ کے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر اس کے ساتھ ایک
بیس سیر وزنی لکڑی کا ٹکڑا باندھ دیا جاتا ہے اور طلبہ کو نقل و
حرکت کے لیے یہ ٹکڑا کندھے پر اٹھانا پڑتا ہے۔"

مذہب کے نام پر خرکاری کی اس سے بدترین مثال اور کیا پیش کی جاسکتی ہے ؟
نیاز فتح پوری نے مذہب کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا وہ غیر جذباتی ہو کر
تحقیقات پر مبنی علمی اسلوب میں لکھا بلکہ اس لحاظ سے تو نیاز کی شخصیت دو لخت نظر
آتی ہے کہ فکشن اور شاعری میں وہ جذباتی شدت کا مظاہرہ کرتا ہے جب کہ ادبی
شخصیات، علمی موضوعات اور مذہبی امور پر قلم اٹھاتے وقت سرد منطقی استدلال روا
رکھتا ہے۔

نیاز کے مذہبی تصورات کے حوالے سے متعدد مقالے قلم بند کیے جاچکے ہیں۔
اس ضمن میں ان مقالات کا مطالعہ سود مند ہو سکتا ہے :

۱۔ ڈاکٹر سید عبداللہ "نیاز ایک مفکر جو منصور نہ بن سکا"

(نگار پاکستان کراچی، نیاز صدی ایڈیشن، اپریل ر ستمبر ۱۹۸۴ء)

۲۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری، "نیاز کا مذہب"

(نگار جشن طلائی نمبر، جنوری فروری ۔ ۱۹۸۲ء)

۳۔ رشید حسن خاں۔ "نیاز اور آزادی فکر" (نگار مئی ۱۹۸۹ء)

۴۔ انتظار حسین۔ نیاز فتح پوری (شب خون الہ آباد، مارچ مئی ۸۷ ۔ ۱۹۸۶ء)

۵۔ ڈاکٹر غلام علی الانا۔ "نیاز فتح پوری کا مذہبی رویہ اور اس کے محرکات"

(نگار۔ فروری ۱۹۸۷ء)

۶۔ ڈاکٹر خان رشید "اردو میں آزادی فکر اور نیاز فتح پوری"

(نگار شمارہ ۴۔ ۵، ۱۹۸۱ء)

۷۔ کرنل غلام سرور "اردو آزادی فکر کا رجحان اور نیاز فتح پوری"

(نگار۔ دسمبر ۱۹۸۴ء)

۸۔ ڈاکٹر سلیم اختر "کیا آج نیاز فتح پوری کی ضرورت ہے؟"

(نگار۔ نیاز صدی نمبر۔ ستمبر۔ ۱۹۸۴ء)

مندرجہ بالا مقالات کے ساتھ خود نیاز کے مقالات اور نگار میں استفسارات کے جوابات "من ویزداں" "مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ" نگار کا "خدا نمبر" اور جنوری ۱۹۵۹ء میں تحریر کردہ نگار کا "تنقیح اسلام نمبر" کا عقلی اور استدلالی نگاہ سے مطالعہ کرنے پر یہ واضح ہوجاتا ہے کہ نیاز ملا کے اسلوب میں کافر، ملحد، دہریہ، زندیق اور ان سے ملتے جلتے القابات کا حقدار نہ تھا۔ نیاز کا قصور وہی تھا جو خرد دشمن معاشرہ میں ہر خردبین اور خرد پسند مفکر کا ہوسکتا ہے۔ وہ عقل، منطق اور تحقیق کے اجالے سے کام لیتا ہے، روایات کا کورانہ مقلد نہیں ہوتا۔ مسلمات کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھتا ہے، بزرگوں کی سند کو دلیل کے محدب شیشہ میں رکھ کر پرکھتا ہے۔ علوم کے پھیلتے دائروں سے اپنا اور اپنے ہم وطنوں کا ذہنی افق وسیع کرتا ہے۔ اندھیرے میں علم کی شمع فروزاں کرتا ہے اور اس لئے وہ مقہور اور مردود بنا رہتا ہے۔ ادھر وطن عزیز میں افراط الفاظ اور کثرت استعمال کے باعث جن الفاظ نے اپنا مفہوم گنوادیا ہے ان میں دہریہ، کافر، ملحد، زندیق اور سیکولر جیسے الفاظ شامل ہیں۔ یہ جانے بغیر کہ ملحد اور سیکولر میں کیا فرق ہوتا ہے اور اس نفسیاتی حقیقت کو فراموش کرکے کہ خالص کفر و الحاد اور حقیقی معنوں میں دہریہ بننے کے لئے جتنے مضبوط اعصاب کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہر کسی کے پاس نہیں ہوتے۔ ملا لوگ جنہیں ان القابات سے نوازتے ہیں وہ محض آزاد سوچ کے حامل تازہ سوچ کے قائل، فکر نو کے داعی اور عقل پسند ہوتے ہیں اور یہی ان کا گناہ کبیرہ ہوتا ہے جس کی سزا میں انہیں دشنامی القابات کے جہنم میں ڈالا جاتا

ہے۔ یہ امر فراموش کرکے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک کا کفر بعد میں کشف ثابت ہوتا ہے ورنہ آج منصور کا کوئی نام بھی نہ لیتا۔ منصور سے یاد آیا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر خان رشید دونوں نے نیاز فتح پوری کے مذہبی رویہ کے لئے منصور کا استعارہ استعمال کیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ "نیاز۔ ایک مفکر جو منصور نہ بن سکا" (افکار نیاز صدی نمبر ستمبر ۱۹۸۴ء) میں "من ویزداں" کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ "اس قسم کی تحریروں سے وہ منصوریت کے امیدوار بھی تھے۔" ڈاکٹر صاحب نیاز کی مذہبی تحریروں کے بارے میں رائے دیتے ہیں کہ نیاز کے سرمایہ عزیز کا کمزور ترین حصہ بھی یہی ہے اگرچہ میں یہ اضافہ ضرور کروں گا کہ انہی تحریروں نے نیاز کو ایک انفرادیت بھی عطا کی۔ وہ محض ادیب نہ تھے بلکہ انہیں ہم آزاد خیالی (لبرل ازم) کی تحریک کا ایک باوقار مفکر بھی سمجھنے پر مجبور ہیں۔" یہ لکھنے کے بعد یہ فرماتے ہیں کہ "یہ سب لکھ کر نیاز خسارے میں رہے، کہ انھوں نے دین و روحانیت کی باتوں کو فلسفہ و سائنسی نظریات کے معیار سے جانچنے کی کوشش کی اور عقلی فیصلے دیئے حالانکہ ہر چند کہ دین (اسلام) کی باتیں عقل کے خلاف نہیں لیکن دین کی ہر بات کو عقل (عقل حاضرہ) کے معیار سے جانچنا غلط طریق کار ہے۔"

ڈاکٹر سید عبداللہ کے استدلال میں گومگو (AHBIVALANCE) کی جو کیفیت ملتی ہے اس کا نفسیاتی مطالعہ دلچسپ ہے کہ وجہ خود ڈاکٹر صاحب کی شخصیت ہی میں مل سکتی ہے یعنی اکبرالہ آبادی کی مانند ان کا بھی مدخولہ گورنمنٹ ہونا اور خود کو ہر قسم کے نزاعات سے محفوظ رکھنا مگر ان کے برعکس ڈاکٹر خان رشید نے جب "اردو میں آزادی فکر کا رجحان اور نیاز فتح پوری" (نگار۔ شمارہ ۴، ۵، ۱۹۸۱ء) قلم بند کیا تو اگر مگر کیے بغیر لکھا:

> "نیاز صاحب حقیقی معنوں میں اردو ادب کے منصور ہیں۔ اس میدان میں وہ انا الحق اور سبحانی لااعظم شانی کے رموز کا نہ صرف گہرا ادراک رکھتے ہیں بلکہ اس کے بے باک اظہار میں

ذرا تکلف نہیں برتتے۔ یہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ اور غالباً
یہی سب سے بڑا گناہ بھی ہے۔"

مذہب یا مذہبی امور کے بارے میں لکھتے وقت نیاز پہلے سے کوئی کلیہ قائم کر کے اس کی مناسبت سے دلائل و شواہد فراہم کرنے کے برعکس پہلے دلائل و شواہد بہم پہنچاتے ہیں۔ یہ استقرائی منطق و الاطریق استدلال ہے کہ پہلے سے طے شدہ نتیجہ ثابت کرنے کے بجائے دلائل و براہین سے نتیجہ تک پہنچایا جائے۔ آپ نیاز کی بات مانیں یا نہ مانیں مگر ان کی منطق سے انکار مشکل ہے۔ چند مثالیں پیش ہیں :

"خدا کے مفہوم کے تعین میں سب سے بڑی غلطی ہر جگہ اور ہر زمانہ میں ہوئی ہے کہ اس دنیا کے انسانی بادشاہ کی طرح پیش کیا گیا جو خوش بھی ہو سکتا ہے اور برہم بھی۔ حالانکہ دونوں کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی شخص جو خدا کو گالیاں دے تو وہ برہم ہو کر اپنے قانون کو نہیں بدل سکتا۔ اگر کوئی ہر وقت سجدہ میں بھی پڑا رہے تو خوش ہو کر اس کی سعی سے زیادہ نہیں دے سکتا اس لئے یہ سمجھنا کہ اگر کوئی قوم بتوں کے سامنے جھکتی ہے، متعدد خداؤں کی قائل ہے تو وہ صرف اس وجہ سے عنداللہ مغضوب ہے، درست نہیں" —— (مذہب کا مستقبل)

"مذہب کا لفظ سنتے ہی سب سے پہلے خدا کا تصور ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ہم مذہب کا ذکر کریں اور خدا کی طرف ہمارا خیال منتقل نہ ہو کیونکہ ذہن انسانی میں یہ بات مرتسم ہو چکی ہے کہ مذہب خدا کی چیز ہے اس کے رفع کرنے میں انسان کو مطلق کوئی دخل نہیں۔ یہ سب سے پہلی چیز جس نے نوع انسانی میں انتشار و افتراق پیدا کیا اور جس کا سلسلہ کسی نہ کسی نہج سے آج تک جاری ہے اس مسئلہ میں سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ مذہب اور خدا کے تصور میں تفوق زمانی کس کو حاصل ہے۔ یعنی انسان کا ذہن پہلے خدا کی طرف منتقل ہوا یا مذہب کی طرف۔ ظاہر ہے سب سے پہلے خدا کا تصور اس کے ذہن میں آیا ہوگا اور مذہب کا

تصور بعد کو' کیونکہ مذہب کی بنیاد خدا کے تصور پر قائم ہے۔" (مذہب کا افادی و عقلی تصور)

"ایک طرف ہم کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ مذہب فطری چیز ہے یعنی عقل انسانی خواہ کتنی ہی ترقی کرتی جائے مذہب کے اصول و عقائد متزلزل نہیں ہوسکتے اور دوسری طرف یہ تاکید بھی ہے کہ مذہب نام ہے بغیر استعمال عقل کے ان باتوں کو بے چوں و چرا تسلیم کرلینے کا جن کو ہمارے اکابر تسلیم کرتے چلے آئے ہیں اور ان دونوں میں و تضاد و تباین پایا جاتا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ("مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ" ص ۷۷)

"اسلام و ایمان نام تھا صرف اتحاد امت کا' نفسی و مالی جہاد کا' سعی و عمل کا' مکارم اخلاق کا' سیروفی الارض کا' اور کفر کہتے تھے صرف افتراق امت کو۔ جہاد سے جی چرانے کو' محنت و کوشش سے ' رب ہونے کو' لیکن اب اسلام نام ہے صرف تسبیح و دعا کا' جبہ و دستار کا' رسم نماز ادا کرلینے کا اور سر منڈا کر رہنا و تقلیدا حرم کے طواف کرلینے کا' اسی طرح کفر کا مفہوم یہاں تک وسیع ہوگیا ہے کہ اگر آج کسی مولوی سے فلسفہ عبودیت پر بحث کرکے نماز کی حقیقت دریافت کرنا چاہتا ہوں تو وہ مجھے کافر' ملحد' فاسق و فاجر کہہ کر نکال دیتا ہے" ("مذہب کا مستقبل")

ان چند اقتباسات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مذہب کے بارے میں نیاز کا رویہ عام مروج مفہوم میں بے گانہ دین کے برعکس ایسے صاحب نظر کا ہے جو خلوص نیت سے خدا' انسان اور مذہب کا باہمی تعلق سمجھنا چاہتا ہے۔

اور اس مضمون کا اختتام نیاز فتح پوری کے ایک مکتوب پر :

" آپ پوچھتے ہیں کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں ؟ معلوم نہیں میری زندگی کے کس پہلو کو سامنے رکھ کر آپ نے یہ سوال کیا ہے !

اگر مقصود میری لٹریری زندگی ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ :

ساختہ ام خامہ زباں پری

اگر مدعا میرے جمالیاتی ذوق کو معلوم کرنا ہے تو یہ کہنا حقیقت کے خلاف نہ ہوگا

کہ :

غازہ نہم بر رخ خورشید و ماہ

اور اگر مراد یہ ہے کہ میرے تاثرات کا صحیح علم آپ کو حاصل ہو تو مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ :

آتش بے دود فروزندہ ام

"کنہ حقیقت کے ذکر سے قصداً احتراز کرتا ہوں کیونکہ آج نہیں تو کل ساری دنیا کے ساتھ آپ خود میرے "نیاز آخر الزمان" ہونے پر ایمان لے آئیں گے۔"

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان

نیاز ایک عمومی مطالعہ

۱

"لوگوں نے سنا ہے' کتابوں میں پڑھا ہے کہ جب سندباد جہازی رخ کے پنجوں میں بندھ کر ایسے جزیرے میں پہنچا جس کی زمین کا چپہ چپہ لعل و یاقوت و نیلم و پکھراج سے پٹا پڑا تھا تو لالچ کی تیز آنچ اس کے سینے میں بھڑک اٹھی اور اس نے دوڑ کر اپنی جیبیں ان جواہرات سے بھر لیں جو اس کے آس پاس پڑے تھے' لیکن جب وہ آگے بڑھا تو اور بہت ہیرے جواہرات دکھائی دیے۔ اس نے فوراً اپنی جیبیں خالی کیں اور ان کو اپنی دانست میں بعد لے بہتر جواہرات سے بھر لیا۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتا رہا یہی صورت حال پیش آتی رہی حتیٰ کہ غروب آفتاب کے وقت وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ کیا لے جائے اور کیا چھوڑ جائے۔"

فضل حق قریشی نے نگارشات نیاز و نگار کے بارے میں اظہار خیال کرتے اس تمثیل کو استعمال کیا ہے۔ میں اس میں اضافہ کروں گا کہ شام کو سندباد کی جیب ان جواہرات کے بوجھ سے پھٹ گئی تھی۔ اور وہ کچھ بھی ساتھ نہ لے جاسکا۔

نیاز کے صنم خانہ حرف و سخن میں پھرتے پھراتے میری بھی کچھ یہی حالت ہو گئی ہے۔ بولایا بولایا پھرتا ہوں۔ ادب' علم' قلم' فن' انشاء' شاعری' فراست الید' تنقید' تحلیل نفسی' حسن' جنسیات' ارضیات' فلکیات' مذہب' تصوف' فاشیات' بغاوت' زرانپ' رومان' ناول' افسانہ' مکاتیب' مباحث' چھیڑ خانی' تارس بلبا' ایوری تھنک'

انڈر دی سن' اللہ اللہ ادبی و علمی ہرکارہ پن کی کوئی حد ہوتی ہے۔ کسی ایک سانچے میں علامہ نیاز فتح پوری کو فٹ کیا جائے؟ کوئی ایسا سانچہ ادب و فن کے پاس ہے بھی جو نیاز ایسی پارہ صفت خوش قرینہ شخصیت کو سہار سکے۔ ایک سیال خلاقیت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا جو اوور فلو کر جاتا تھا ہر دائرۂ سخن و فن کو۔ ان کی شخصیت و فن اور فکر رسا کی کار گزاریاں اعتراف عجز و پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ان کی علمیت کے سامنے زانوئے احترام و محبت طے کرنا ہی پڑتا ہے۔ نیاز ایسا مختلف الجہات وجہات شخص اردو ادب کو کم ہی ملا ہوگا۔ جوش ملیح آبادی خود جن کے آگے اردو کی ڈکشن ہاتھ باندھے کھڑی نظر آتی ہے' اعتراف کرتے ہیں کہ :

> ایک ذات میں اتنے خلاقی کے شہر آباد ہیں اتنے شعور کے لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں اور رامش و رنگ کی اتنی بے شمار براتیں اتری ہوں تو بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ ان کو کلیجے سے لگا لوں۔ کاش نیاز کا سا خالق طرز انشا پرداز کسی زندہ قوم میں پیدا ہوتا ہے :
>
> ہائے رے عقل جو زنجے میں ہے دیوانوں کے

نیاز صحیح معنوں میں ایک انسائیکلو پیڈیسٹ ادیب تھے۔ ادبی دیو اور جینئس جن کی فنی و فکری عبقریت کو ان کے کٹر دشمنوں نے بھی سلام عقیدت پیش کیا ہے۔ نیاز ۱۹۱۰ء ' ۱۹۶۰ء تک کے عہد ادب کا نام ہے۔ اس عہد ادب میں اونچے طبقے میں صاحب علم و فن ہونے کی پہچان یہ بن گئی تھی کہ نیاز و نگار پر کوئی کتنی بحث کر سکتا ہے۔ وہ علامتی تھے' مذمور تھے' مرد آہن تھے' اپنے افکار و نظریات میں اٹل و اٹوٹ' ناقابل شکست کردار و اعصاب کے مالک۔ کفر کے فتوے زندگی بھر ان کا تعاقب کرتے رہے۔ وہ ڈرے نہ جھکے' اپنی میز کی دراز میں ایک لمبا سا خنجر رکھ کر لکھنے پڑھنے میں مصروف رہے۔ خود کشی کی حد تک پہنچے ہوئے بے باکی کے مالک نیاز کبھی کسی مخالف سے نہیں گھبرائے نہ کبھی اعتذار کی ضرورت. سمجھی۔ جو کیا ڈنکے کی چوٹ پر کیا۔ کر لو جو کرنا ہے۔ مقدمہ بننے اور مرنے مارنے کی نوبتیں آئیں' نیاز سنگلاخ چٹان بنے۔ اپنے

بغاوت کے مورچے میں ڈٹے رہے۔ کیا تو زیادہ سے زیادہ بقول ٹی ایس ایلیٹ یہ کیا کہ جب افکار پریشان اور مخالفتوں کے بے پناہ تیر چلتے تو کہتے "میں اپنے خیالات کو کہتا ہوں کہ جاؤ اور بیاض میں آرام کرو اور یوں میری طبیعت ہلکی ہو جاتی۔" وہ لفظوں کے دکھوں کا علاج لفظوں میں ہی ڈھونڈتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

> اچھا تو سنو' میں نے بھی ایک فیصلہ کیا ہے اور وہ یہ کہ تمہیں کس طرح یہ یقین دلا دوں کہ جو کچھ تم چاہتے ہو وہ پورا ہوگیا۔ کل شام ایسی آندھی چلی کہ میرے مکان کی چھتیں گر پڑیں۔ دیوار و در سرنگوں ہوگئے۔ اس کے بعد دفعتاً ایک گوشے سے شعلہ بلند ہوا اور میری ایک ایک چیز کو خاکستر کر گیا۔ میں گھر سے نکل بھاگا تو لوگوں نے پتھر مارنے شروع کر دیے۔ میں گھبرا کر ایک کنویں میں کود پڑا اور وہیں ختم ہوگیا۔ تمہیں خوش کرنے کے لیے اس سے زیادہ میرے امکان میں نہ تھا۔"

نیاز کے حریف یہی چاہتے تھے' مگر نیاز ان کے سینوں پر مونگ دلتے' اپنے افکار و نظریات کے لاؤ لشکر سمیت زندگی کرتے رہے۔ ہر باب میں سب سے الگ راہ نکالی' ہر منہ زور رویے سے بھڑ گئے' باولر جذبات کے علی الرغم چلے اور ڈٹ کر چلے۔ سرسید' حالی' شبلی کی افادی نثر و اسلوب کے مقابلے میں رومانی نثر و اسلوب کی باراتیں سجا دیں۔ غالب کے مقابلے میں مومن کو لا کھڑا کیا۔ ابو الکلام کی دینیات کے مقابلے میں اپنی لا دینیات کا طومار باندھ دیا۔ اقبال مرد مومن کو سامنے لا رہا تھا۔ نیاز نے سائیکی کو ماڈل بنا کر فکر و خیال کے صنم خانے وا کر دیے۔ نیاز نے اپنی نثری اسلوب اور مواد کے زور پر سرسید کی پوری تحریک مقصدیت کے متوازی و متبادل ایک رومانی جہان نو آباد کر دیا اور تاریخ کے بہاؤ کو ہی بائی پاس کر دیا۔ تخلیق علم اور بغاوت کی تین رویں ان کے اندر پورے زور و شور سے متوازی چلتی رہیں۔ تخلیق کرنے پر آئے تو افسانوی نثر کا قابل رشک ذخیرہ جمع کر دیا جسے افادی ادب کے رسیا بھی چھپ چھپ کر پڑھتے رہے اور سر دھنتے تھے۔ علمی فتوحات پہ آئے تو بحر ظلمات میں گھوڑے

دوڑائے۔ سات سو علمی ادبی مقالات، ۵۰۰ معلوماتی مضامین، ۱۵۰ سوانحی تحریریں، ۳۰۰۰ تبصرے، ہزاروں ملاحظات و استفسارات، ہزاروں مکاتیب لکھ لکھ کر دامن اردو کو متنوع مضامین و افکار سے مالا مال کر دیا۔ بغاوت پہ آئے تو جو نقش کہن نظر آیا مٹا دیا۔ کاہن اور مذہبی اجارہ داروں کے گھروں کے در و دیوار ہلا دیے، بن بیٹے مٹے پندار ذات و انا اور بت شکنی میں مدہوش تھے۔ فرزند آزر بن کر توہمات و مسلمات کے لات منات کو کرچی کرچی کر گئے اور نعرہ مستانہ بھی لگا دیا۔

> آپ کو معلوم نہیں جس طرح ہر صدی میں ایک مجدد پیدا ہوا کرتا ہے اسی طرح ہر سو سال بعد ایک رند پیدا ہوا کرتا ہے۔ ممکن ہے وہ مجدد آپ ہی ہوں لیکن اس صدی کے رند کی بابت مجھ سے پوچھئے کہ کون ہے۔ ہر چند یہ خود ستائی ہوگی، لیکن آپ کو بتا دوں کہ ہم ہی رند ہیں۔ سنا آپ نے۔ رند!

نیاز فتح پوری کی زندگی طرح طرح کے نشیب و فراز سے گزری ہے۔ وہ رومان پسندی کی نظر فریب فضاؤں سے گزرتے تعقل پسندی کی گمبھیر راہوں تک پہنچے۔ شعر سے نثر، محبت سے مذہب تک کی منازل انھوں نے طے کیں۔ مگر دو باتیں ان میں ہر حال میں موجود رہیں یعنی انسان دوستی اور انتہا پسندانہ مذہبی لبرلزم۔ ان کی تربیت ایسے ماحول میں ہوئی کہ وہ ابتدا سے ہی آزاد خیالی کی راہ پر گامزن ہوگئے۔ والد پولیس میں تھے۔ مذہبی آدمی ہونے کے باوجود سخت گیر ہونے کی جگہ روشن خیال آدمی تھے۔ نیاز کے ایک ہی سوتیلے بھائی تھے جن کا بہت بچپن میں انتقال ہوگیا تھا اس لیے والد کی تین شادیوں سے واحد زندہ نرینہ اولاد ہونے کے حوالے سے گھر میں ان کا راج بھی چلتا تھا۔ مالی خوش حالی اور ناز و نعم بھی میسر تھا۔ اپنی ابتدائی تربیت اور والد صاحب کے رویئے کے بارے میں نیاز لکھتے ہیں :

> ”تربیت اخلاق کے باب میں میرے والد کا نظریہ بڑا عجیب و غریب تھا۔ وہ جنسی داعیات کے دبانے کے قائل نہ تھے بلکہ ان کی تسکین ہی کو ذہنی و جسمانی نشوونما کا صحیح ذریعہ قرار دیتے

تھے۔ اس لیے جب میں اپنی عمر کی حدود میں آگیا جہاں ان کو اپنے نظریے کا عملی تجربہ کرنا تھا تو انھوں نے مجھے بالکل آزاد چھوڑ دیا۔ اور اب سے ۶۰ سال قبل (۱۹۰۱ء میں) لکھنؤ کیا چیز تھا اور اس میں کسی نوجوان کا آزاد چھوڑ دیا جانا کیا معنی رکھتا تھا۔ یہاں جینے سے زیادہ مرجانے کو جی چاہتا تھا۔

آپ تھے، میں تھا، شب ماہ تھی، تنہائی تھی
ہائے وہ وقت کہ دشوار تھا جینا مجھ کو
اف ری مجبوری الفت یہ خبر کس کو تھی
تم کو چاہوں گا تو جینا بھی پڑے گا مجھ کو

والد صاحب نے لکھنؤ کی فضاؤں میں آزاد چھوڑ دیا۔ وہاں شروع کے دنوں میں نیاز کو پکڑ کر مسجد میں بھیجا گیا۔ وہاں انھوں نے جو مناظر دیکھے وہ ان کے دل و دماغ پر ثبت ہو گئے اور روایتی مذہبیت اور جور آزما ملائیت سے ان کی سرد و گرم جنگ شروع ہو گئی۔ حافظ خانہ میں بچوں سے جس طرح کا تشدد روا رکھا جاتا تھا اس کا نیاز کے دل پر گہرا اثر ہوا ہے۔ لکھتے ہیں :

"اس لیے خدا کا شکر ہے کہ حافظ خانہ سے مجھے واسطہ نہیں پڑا، لیکن یہاں جو عذاب بچوں پر نازل ہوا کرتا تھا اس سے میں کیا شہر کا ہر شخص واقف تھا۔ صبح سے دوپہر تک حافظ خانہ کی چیخ و پکار اور بچوں کی آہ و بکاہ سے مجھے سخت تکلیف پہنچتی تھی۔ کبھی کبھی والد سے کہہ دیا کرتا تھا کہ اگر قرآن حفظ کرانا اس حد تک ضروری ہے کہ بچہ کا جسم و دماغ دونوں مجروح و بیکار کر دیا جائے تو قرآن (حفظ) سے انکار ہی بہتر ہے۔"

ان کی ملا دشمنی کی ابتدا بھی اسی زمانے میں ہوئی۔ اتفاق سے ان کا واسطہ ایسے ملاؤں سے پڑا جو فرعونی رعونت کی تصویر تھے جن کا یہ کہنا تھا کہ مذہب کا عقل سے کوئی واسطہ نہیں اور ان کا پندار کہ وہ عام سطح سے بہت بلند ہی اور ہر شخص کا فرض

ہے کہ وہ انھیں دیکھتے ہی سر بسجود ہو جائے۔

"میں جس وقت ان (ملاؤں) کے بطون کا تصور کرتا تھا تو وہ مجھے بالکل سیاہ پتھر کی طرح نظر آتا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کی روح بالکل اجاڑ ہے اور ان کا دل بالکل ویران ہے اور روحانی لطف اور جمالیات ذوق کے لحاظ سے ان کی ہستی بالکل وادی غیرذی زرع کی حیثیت رکھتی ہے۔"

پھر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ باوجود مولانا کی خشونت و برہمی کے نیاز سے نہ رہا جاتا اور طالب علمی کے ابتدائی زمانے میں ہی اپنے اساتذہ سے الجھ بیٹھتے تھے۔ لکھتے ہیں:

"ایک دن دوران درس ایک حدیث آئی جس میں رسول اللہؐ سے کسی نے دریافت کیا کہ دنیا میں سردی گرمی کیوں ہوتی ہے؟ اس کا جواب رسول اللہؐ نے دیا کہ آسمان میں ایک اژدھا ہے جب وہ اپنی سانس دنیا کی طرف چھوڑتا ہے تو گرمی ہو جاتی ہے اور جب سانس کھینچتا ہے تو سردی ہو جاتی ہے۔ یہ حدیث پڑھتے ہوئے باوجود انتہائی ضبط کے بے اختیار میرے منھ سے نکل گیا کہ غلط۔ یہ سنتے ہی مولانا کا یہ حال ہوا کہ جیسے آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔ اور بولے کہ بدتمیز تو رسول اللہؐ کو غلط کہتا ہے۔ میں نے کہا، میں رسول اللہؐ کو غلط نہیں کہتا بلکہ اس حدیث کو غلط کہتا ہوں۔ کیوں کہ رسول اللہؐ کبھی ایسی خلاف عقل بات نہیں کہہ سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا نے اپنا ڈنڈا اٹھایا اور میں اٹھ کر بھاگا۔ مولانا نے کچھ دور میرا تعاقب کیا لیکن میں ہاتھ نہ آیا اور اس طرح ہمیشہ کے لیے میرا پیچھا ان سے چھوٹ گیا۔"

یہ صورت حال زندگی بھر قائم رہی۔ فرق صرف یہ پڑا کہ اب نیاز بھاگتے نہ تھے۔

مولانا کے مقابلے میں میدان میں ڈٹ کر کھڑے ہوگئے تھے اور ہر وار کو سینے اور سر پر سہتے تھے۔ اپنے سوانحی مضمون میں لکھتے ہیں :

"جوں جوں زمانہ گزرتا گیا میں مولویوں کے بتائے ہوئے اسلام سے متنفر ہوتا گیا اور میرا یہ جذبہ نگار کے اجرا کے بعد اس حد تک شدید ہوگیا کہ کہ آخر کار میں نے اس جماعت کے خلاف ایک محاذ قائم کردیا اور ان کے عقائد اور ان کے اخلاق پر نکتہ چینی شروع کردی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سارے ملک کے مولوی میرے دشمن ہوگئے۔ مختصر یہ کہ اپنی زندگی میں سب سے زیادہ اثر میں نے جس کا لیا وہ مولویوں کی جماعت تھی، لیکن یہ تاثر انکاری تھا۔"

نیاز کے مذہبی اعتقادات ہر دور کے روشن خیال تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات سے ملتے جلتے ہیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ نیاز صاحب ان باتوں کا اظہار کھلم کھلا اور چیلنج کرکے کردیا کرتے تھے جب کہ اکثر لوگ صرف ہم خیال لوگوں کی نجی محفلوں میں دبے الفاظ میں یہی باتیں کرتے ہیں۔ نیاز کی تحریریں اگر انکاری اوراجتہادی افکار و خیالات کی انتہا پسندانہ ترجمان ہیں تو ان کی ذاتی زندگی معقولیت اور صبر و سکون اور پابندی صوم و صلوٰۃ کی تقدیر ہے۔ ان کی ساری لڑائیاں کاغذوں میں ہی لڑی گئی ہیں۔ وہ اعتقادات و نظریات کے فکر و تصادم کے قائل تھے نہ کہ خود لٹھ لے کر غازی یا شہید بننے نکلتے۔ اپنی ذاتی زندگی کو انھوں نے اپنی حدود میں رکھا۔ عین جوانی کے عالم میں نماز پابندی سے پڑھتے تھے۔ ملا واحدی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں :

"نیاز صاحب نماز کے نہایت پابند تھے۔ بارہا ایسا ہوتا تھا کہ نیاز صاحب کہتے، سنیما جاتے وقت مجھے حکیم اجمل خاں کے مکان سے لے لیجئے گا۔ میں اس وقت شریف منزل کے بجائے سامنے والی مسجد میں عصر کی نماز پڑھتے پاتا۔ یہی وہ مسجد ہے جس کے زیر سایہ مرزا غالب کا گھر تھا۔ میں اور نیاز صاحب قریبا

روزانہ ہی فلم دیکھتے تھے اور نیاز صاحب فلم دیکھ کر کوئی نہ کوئی مضمون ضرور لکھتے تھے۔ کیوپڈ اور سائیکی ایڈی نے فلم سے ہی متاثر ہو کر لکھا تھا (۱۹۴۴ کی بات ہے)۔

ملا واحدی نیاز نامہ صفحہ ۹۷۔

نیاز نے مولوی کے مذہب کی ہر جگہ مخالفت کی ہے۔ وہ مذہب کو کسی مولوی کی آنکھ سے دیکھنے کے روادار ہی نہیں تھے۔ اور نہ اس مذہب کو اسلام کی روح سے ہم آہنگ سمجھتے تھے۔ مولوی سے نیاز کی نفرت اتنی گہری اور شدید تھی کہ وہ اس کے اظہار کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ ایک مکتوب میں مولوی کا ذکر آیا تو ان کا اشہب قلم فراٹے بھرنے لگا۔

"آپ نے کس طبقہ کا ذکر کیا۔ آپ اتنا وقت کسی گناہ میں مصروف رہتے تو بہتر تھا۔ محراب دعا سے حلقہ دام تیار کرنے والے، کوتاہ آستین کے باوجود انتہائی دراز دستی سے کبھی نہ چوکنے والے اور آہ سب کچھ کر گزرنے والے جو دوسروں کے لیے ممنوع ہے۔ ہماری قوم کے وہ افراد جنھیں پاؤں کا چھالا کہنا چاہیے کہ جب تک آپ پھوڑ نہ ڈالیں راستہ چلنا ممکن نہیں۔ انھوں نے سلطنتوں تک کو کھا لیا۔ قوموں کو ہضم کرلیا۔ مذہب کیا چیز ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر ہمارے شہر کے بہشتی معمار کش دور باقی نہ رہیں تو عوام کو واقعی تکلیف پہنچے، لیکن اگر مولویوں کی جماعت فنا ہو جائے تو قوم کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ (من ویزداں - اول صفحہ ۳۴۳)

(غضب خدا کا) ایک طرف یہ کہتے ہیں کہ اسلام نے بت پرستی کو مٹایا اور دوسری طرف اس میں مبتلا ہیں۔ بت خواہ وہ خدا ہی کا کیوں نہ ہو، بت ہے اور توڑے جانے کے قابل ہے اور خدا خواہ وہ کوئی بت ہی کیوں نہ ہو، قابل پرستش ہے۔ اگر

تم اس نازک فرق کو نہیں سمجھ سکتے تو جاؤ اٹھو وضو کر کے نماز
پڑھو، تمہارا بت تم سے خفا نہ ہو جائے۔ میں بھی جاتا ہوں آئینہ
سامنے رکھ کر اپنے خدا کو پوجوں گا"

سالنامہ نگار ۱۹۶۰ء جنوری صفحہ ۹۳)

نیاز کی تحریر کے اس اقتباس کے آخری حصے سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ وہ انسان کو خدا کی اعلی ترین مخلوق سمجھتے ہیں اور انسان سے محبت کو دراصل خدا سے محبت قرار دیتے ہیں۔ چاہے یہ محبت اپنے آپ سے ہی کیوں نہ ہو۔ اس ٹکڑے سے ان کی خود پرستی بھی ظاہر ہوتی ہے اور من عرفہ نفسہ فقد عرفہ ربہ کی خوشبو بھی آتی ہے۔ نیاز خدا کی وحدانیت اور خلاقانہ ربانیت کی سب سے بڑی دلیل ہی تخلیق آدم اور خلاقی حسن و جمال کو قرار دیتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :

"خدا کا وجود ثابت کرنے کے لیے لوگ خدا جانے کیا کیا
۔ بے سروپا دلائل پیش کرتے ہیں حال آنکہ اس سے زیادہ دلیل
اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ایک حسین عورت بھی پیدا کر سکتا
ہے۔" (جمالستان نمبر ص ۱۱۶)

انسان کی عظمت کے بارے میں ایک جگہ رقم طراز ہیں :

"جب انسان جاہل تھا تو خدا بنانے میں اپنا وقت ضائع کرتا
تھا لیکن اب عقل آئی اور وہ انسان بنانا چاہتا ہے۔ خدا کی تعمیر
بڑی آسان تھی جو چیز سمجھ میں نہ آئی اس کو خدا کہہ دیا لیکن
انسان تو وہی چیز بن سکتی ہے جو سمجھ میں آجائے۔"

نیاز زندگی بھر انسان کو سمجھنے میں مصروف رہے اور مولوی ان کو کافر بنانے کے حربے کرتے رہے۔ مولوی کی کفر سازی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"'غضب خدا کا' میں سو بار کہہ چکا ہوں کہ خدا کی عظمت و
جبروت اور اس کی قوت و قدرت کا اس طرح قائل ہوں کہ
شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ ہزار بار لکھ چکا ہوں کہ رسولؐ کی

صداقت و بلندی پر جس طرح ایمان لایا ہوں شاید ہی کوئی دوسرا
ایمان لایا ہو، لیکن باوجود اس اقرار کے میں کافر ہوں، ملحد ہوں،
مرتد ہوں۔"

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں
(اقبال)

پروفیسر احتشام حسین کے بقول نیاز صاحب کے غور و فکر کے اصل مراکز مذہب اور ادب تھے جو یوں تو الگ الگ رہتے ہیں، مگر ان کے طرز فکر میں آزادی خیال کی منزل پر پہنچ کر یکجائی حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کے یہاں یزداں واہرمن پر مذہب کا کوئی عکس نہیں پڑتا تھا۔ جیسا کہ آج کی بعض اسلامی تحریکوں کا تقاضا ہے۔ ان کے یہاں یزداں واہرمن دونوں کے جلال و جمال سے محبت کرنے کی رومانی اور وجدانی خواہش موجود تھی۔ لیکن وہ دونوں کو اپنے اپنے انداز میں دیکھنے پر مصر تھے۔ جب انھوں نے اپنے کسی دوست کو خط لکھا تھا کہ اگر آپ حج کو جارہے ہیں تو ذرا اسلامی ممالک کی سیر بھی کر لیجیے گا اور اگر دمصنا بھی جانے کا موقع ملے تو وہاں سے میرے لیے کسی حورویش کی تصویر لیتے آئیے گا۔ اس کا خیال ضرور رکھیے گا کہ وہ تصویر آب زمزم سے دور ہی رہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے چھلکنے سے خراب ہو جائے۔ تو یہ محض شوخی تحریر کا تقاضا نہیں تھا اس میں نیاز کا ذہن بھی منعکس ہو رہا تھا۔ (سالنامہ نیاز نمبر ص ۱۷۰)

نیاز کا فکری تعلق معتزلہ کے تعقل پسند نظریہ حیات و مذہب کے دھارے سے تھا۔ اس روش کو انھوں نے بغیر کسی تحفظات کے اپنی ذہنی ترجیحات کے عین مطابق قبول کیا تھا۔ وہ اس بارے میں دل کے پاس پاسبان عقیدت و عقاید کے بٹھانے کے روادار نہ تھے۔ وہ مذہب کے باب میں اتنی مابعد الطبیاتی حقیقی کیفیت کو برداشت کرنے کو تیار نہ تھے جتنی وہ عورت کے رومانی روپ کو دینے کو تیار تھے۔ وہ حسین عورت کے قدموں میں لوٹنیاں مارنے کو عقل سے ماورائی نہیں سمجھتے تھے البتہ مذہب

کے سلسلے میں ہر بات کو منطق کے تول میں تولنا چاہتے تھے۔ قرآن کے حادث و قدیم ہونے کے باب میں ان کے نظریات اس سلسلے کی اہم دلیل ہیں۔

نیاز خدا اور مذہب کے متعلق بہت لبرل اور منفرد نکتہ نظر رکھتے تھے۔ وہ اپنے مذہبی وضو یا تصور خدا کو اتنا کچا نہیں سمجھتے تھے کہ ایک چھینک آنے سے اس کے ٹوٹ جانے کا خطرہ ہو۔ وہ خدا کو انسانی سانچے میں ڈھلی محدود و مبغوض ہستی بھی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اس بات میں بہت بڑی گستاخی اور انتہا پسندی کا مظاہرہ کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ وہ ان لوگوں کی کھلی اڑاتے تھے جو اپنے چھوٹے چھوٹے ذہنوں میں چھوٹے چھوٹے خدا بسائے پھرتے ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

"ہوش میں آؤ زہد و تقویٰ بھی وقت وقت پر اچھا لگتا ہے۔ یہ نہیں کہ میاں کو چھینک آئی اور تسبیح پر ہاتھ پہنچ گیا۔ سر میں درد ہوا اور مصلیٰ بچھ گیا۔ اللہ میاں کو توبہ توبہ تم نے اپنا خانہ زاد سمجھ رکھا ہے جو بات بات میں تمہارے پیچھے دوڑتا پھرے گا۔ کیا دنیا میں ہم سے گناہ گاروں کی کمی ہے جو تم ایسے زاہدان عبوس کی طرف توجہ کرے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم عبادت و ریاضت چھوڑ دو یا میری طرح بے دین ہو جاؤ، لیکن یہ کیا حرکت کہ

زہر مرض کہ بنالد کسے شراب دہید"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

"ہوش کی باتیں کرو، خدا اگر چنگیز و ہلاکو نہیں تو حاتم طائی اور جعفر برمکی بھی نہیں۔ نہ اس کو تمہاری عبادت کی پرواہ نہ میری سرکشی کی۔ یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ وہ تمہارے سجدہ کرنے سے خوش ہوتا ہے اور میری شراب خوری سے پیشانی پر شکنیں ڈال لیتا ہے۔ نہ تم نمازیں پڑھ پڑھ کر کوئی بت کدہ مسمار کر سکتے ہو اور نہ میں اپنی بت پرستیوں سے کعبہ ڈھا سکتا ہوں۔

اس دربار میں جنید و شبلی کے لیے خاص رعایت ہے' نہ بہرام و جمشید سے کوئی عداوت۔

مباش در پئے آزار   و ہرچہ خواہی کن

نیاز کے مذہبی رویوں سے ان کے دوست بھی شاکی رہے۔ انھوں نے نیاز کو کسی پہنچے ہوئے آدمی کے حضور جانے اور روحانی فیض حاصل کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ نیاز صاحب جیسے آدمی سے توقع تو نہیں کی جاسکتی تھی۔ نہ ان کو اپنے مذہبی نظریات کے بارے میں کسی قسم کا وسوسہ لاحق تھا۔ مگر وہ دوستوں کے اصرار سے کسی بزرگ کی محفل میں بھی جا کر بیٹھے۔ مگر وہاں سے بھی فیض حاصل کرنے کی جگہ غیظ و غضب ہی لے کر لوٹے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

"رہبری کا شکریہ۔ لیکن کیا کروں میری عمر گمراہی تو سکندر کی سی گمراہی ہے کہ خضر بھی آب حیواں تک پہنچانے میں کامیاب نہ رہے۔ میں آپ کی ہدایت پر "ان" کی صحبت مراقبہ سلوک میں شریک ہو چکا ہوں۔ گھنٹوں سر جھکائے رہنے کے بعد گردن میں درد تو ضرور ہوا' لیکن دل پہ اتنا اثر بھی نہ ہوا کہ حضرت کی صورت ہی مجھے اچھی لگنے لگتی۔ فرمایا' کیا چاہتے ہو؟ جواب دیا' روحانیت۔ بولے روحانیت سے کیا مراد ہے؟ میں نے کہا بادہ خوری کی توفیق' گناہ کرنے کی صلاحیت۔ قریب تھا کہ میری گردن میں ہاتھ دے کر مجھے نکال دیتے' لیکن میں نے کہا جناب غصے کی بات نہیں۔ جب روحانیت کا مفہوم خود آپ مجھ سے دریافت کر رہے ہیں تو سوائے اس کے اور کیا عرض کروں۔ یہ سن کر غصہ کیا کم ہوتا؟ ایک حد تک ضبط پر قادر ہو گئے اور فرمایا پھر بھی تمہارے نزدیک کوئی نہ کوئی مفہوم روحانیت کا ہوگا وہی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا' میرے نزدیک روحانیت کا نام ہے پاکیزہ اخلاق کا۔ دریافت فرمایا کوئی مثال دو۔ میں نے جواب دیا'

مثلاً گاندھی۔ اب کیا پوچھیے کہ سن کر ان کا کیا حال ہوا۔"
نیاز کا تصور گناہ و ثواب بھی غالب کے انداز زندگی سے ملتا جلتا ہے۔

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے میرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

نیاز لکھتے ہیں :

"اگر برا نہ مانئے تو عرض کروں کہ نماز روزہ کے ساتھ ساتھ کبھی کوئی گناہ بھی کر لیا کیجئے کیوں کہ زندگی کا احساس "گناہ کے بعد بڑھ جاتا ہے۔"

غالب کہتا ہے

خجلت نمرود حسنا تم نیافتد
جز روزہ درست ز صہبا کشودہ

مگر یہاں تو انشاء اللہ نامہ اعمال بالکل ہی کورا ملے گا۔ وہاں کم از کم ایک ایک روزہ تو تھا خواہ وہ شراب سے ہی کیوں نہ کھولا گیا ہو۔ مگر یہاں تو ساری عمر اس حسرت میں بسر ہوئی کہ شراب ہوتی تو روزہ رکھا جاتا۔"

نیاز کے بعض مذہبی معتقدات سے بلاشبہ عامتہ المسلمین کو اختلاف تھا۔ ان کے اکثر اعتقادات سے اتفاق کیا جاسکتا ہے نہ ایسا کرنا ضروری ہے۔ وہ کوئی مذہبی عالم یا امام وقت نہ تھے۔ ایک شاعر' ادیب' دانشور اور ادبی صحافی تھے۔ اپنی منفرد سوچ رکھتے تھے۔ منافق نہ تھے۔ اس کا برملا اظہار کرتے تھے۔ کسی کے کفر یا مسلمانی کا فیصلہ کرنا یہاں کے انسانوں کا کام نہیں۔ وہ اچھے مسلمان تھے یا نہیں' بے نڈر اور صاحب علم و فراست انسان ضرور تھے۔

ڈاکٹر منظور احمد

دانش وری کی روایت اور نیاز فتح پوری[۱]

''انسانو سنو: وہی دانا ترین ہے جو سقراط کی طرح یہ جانتا ہے کہ حقیقتاً اس کے علم کی قدر و قیمت کچھ نہیں ہے''

''مکالمات افلاطون''

دو سال پہلے، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے حکم پر میں نے اسی اجتماع میں ''نیاز، روشن خیالی، اجتہاد اور اسلام'' کے موضوع پر نیاز فتح پوری کے حوالے سے ایک مقالہ پیش کیا تھا۔ ہمارے معاشرے میں اگر فکری راہ میں کسی پیش رفت کی کوشش کی جاتی ہے تو معاشرتی مزاج اسے دشنام سے نوازتا ہے۔ اگر نیاز فتح پوری اپنے تصورات اور نقطِ نظر کے ساتھ کسی طبقے کے لیے قابلِ قبول نہیں تو اس کا معقولیت سے اور دلیل سے جواب دینے کی بجائے آپ آسانی سے اور بلا کسی ثبوت کے اس شخص کی نیت پر حملہ کر سکتے ہیں، اس کو ایک خاص طبقے یا جماعت سے خارج سمجھنے لگتے ہیں یا بعض اوقات کسی 'گمراہ' طبقے کا رُکن سمجھ کر اس کے قتل کے درپے ہو جاتے ہیں۔

نیاز فتح پوری دانش کے عالمی تناظر میں دانش کے کسی نئے مکتبہ فکر کے موجد نہیں کہے جا سکتے۔ لیکن دانش وری کا ایک بڑا حصہ دانش عصر کے کسی پہلو کی نئی تشریح و توضیح یا بعض کمزور پہلوؤں پر تنقید کرنے یا بعض مبہم گوشوں کو اجاگر کرنے پر بھی مشتمل ہوتا ہے۔ سرسید کسی نئے نقطہ نظر کے موجد نہیں تھے اور نہ ان معنی میں اقبال جن معنوں میں مغرب میں ڈیکارٹ، نطشے یا برگساں تھے لیکن پھر بھی، اسلامی تناظر میں ان کا کام بڑی حد تک اس معروف ڈگر اور روش سے ہٹ کر تھا جو اسلامی دنیا کے نام نہاد دانش ور یا علما، انجام دے رہے تھے۔ نیاز فتح پوری بھی اس قبیل دانشوراں کے ایک فرد تھے۔

دانش وری ایک ہمہ جہتی تصور ہے، آگے بڑھنے سے پہلے اس کی تھوڑی سی تفہیم ضروری ہے جس کے تناظر میں نیاز فتح پوری کے کام کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں ہمیں مدد ملے گی۔ دانش وری کی کوئی سائنسی یا ریاضیاتی تعریف تو ممکن نہیں ہے اور اسے مختلف ادوار اور

---

[۱] یہ مقالہ، ۲۷ دسمبر ۲۰۰۷، جمعرات کو علامہ نیاز فتح پوری یادگاری لیکچر کی سالانہ تقریب منعقدہ نیپا آڈیٹوریم کراچی میں پیش کیا گیا (فرمان فتح پوری)

انسانوں کے اس مجموعہ کا نام ہے جو اپنے خیالات کی ترسیل میں عام سطح سے بلند ہو کر ایسے اشارات اور علامات کو ذریعہ اظہار بنائیں جو اپنی وسعت کے اعتبار سے ایک عموم رکھتے ہوں اور انسان، معاشرہ، فطرت اور کائنات کی جزئیات کا بیانیہ نہ ہوں بلکہ نسبتاً تجریدی طور پر ایسے اصولوں کا بیان ہوں جن کا اطلاق جزئیات پر ہو سکے۔ یہ طریق بیان دانش ور کی افتاد طبع سے بھی متعلق ہو سکتا ہے اور کبھی علیحدہ علیحدہ۔ یہ صرف دانش وروں کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ بعض اوقات کسی وجہ سے یہ طرز بیان وہ لوگ بھی اختیار کر لیتے ہیں جو کسی دانش وری کے کام میں مصروف نہیں ہوتے۔ دانش وری انسانوں کی بحیثیت مجموعی ایک فطری ضرورت ہے۔ دانش ور انسان کو، معاشرہ، کائنات اور فطرت کی سمجھ اور اس کو کنٹرول کرنے کے طریقے فراہم کرتا ہے۔ دانش وری کی ضرورت اگرچہ عام ہے لیکن دانش وری کی صفت انسانوں میں یکساں نہیں ہے۔ دانش وری کے نتائج سائنسی، عالمانہ، فلسفیانہ، مذہبی اور آرٹسٹک کارناموں کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ عموی طور پر دانش وری کی روایت ایسے اداروں کی تشکیل کا تقاضا کرتی ہے جہاں یہ پروان چڑھ سکے اور عام طور پر جامعات، تحقیقی مراکز اور درسگاہیں جو اہل علم کے روزگار کا ذریعہ بھی ہیں اس ضرورت کو پورا کرتے ہیں، اگرچہ دانش وری صرف ان ہی اداروں کی مرہون منت نہیں ہے۔ مثلاً تھیوسی ڈائیڈس (Thucydides) ابن خلدون، ایڈورڈ ہائڈ (Edward Hyde)، شیٹو بریاں (Chateaubriand) ٹی ایس ایلیٹ میں کوئی بھی تعلیمی یا تحقیقی اداروں سے وابستہ نہیں رہے۔

دانش وری کے اداروں کی ضرورت کئی وجوہات سے پیش آتی ہے۔ ایک تو یہی ہے کہ مختلف معاشروں میں صرف ذاتی دانش وری کے زور پر انسان ضروریات زندگی پوری نہیں کر سکتا اور ان لوگوں کے لیے جو اگرچہ دانش وری میں دلچسپی نہیں رکھتے لیکن اس کے نتائج کے ضرورت مند ہوتے ہیں یہ ادارے بقدر ضرورت معلومات اور علم فراہم کر دیتے ہیں جس کے زور پر معاشی ترقی یا طرز حیات میں تبدیلی واقع ہو سکتی ہے۔ دانش وری سے فائدہ اٹھانے والے عام آدمی، مریض، خریدار، قاری، سامع، سرمایہ کار، کاشتکار غرض ہر قسم کے ضرورت مند شامل ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے اکثر دانش وری سے راست فائدہ نہ اٹھا سکتے ہوں لیکن اس کے نتیجہ میں

مختلف اداروں کی مدد سے جو ٹیکنالوجی وجود میں آتی ہے یا سلطنتوں کے نظام ونسق کے لیے جو پالیسیاں بنتی ہیں وہ سب بالواسطہ دانش وری کا فائدہ ان کے استعمال کنندہ کو پہنچاتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دانش وری کے استعمال کرنے والے خود دانش ور نہیں ہو سکتے۔ مثلاً بڑے بڑے انجینئرنگ پروجیکٹ کے منصوبہ ساز یا سلطنت کے ایسے اہم کار پرداز جو نظم ونسق کی منصوبہ بندی کرتے ہیں وہ دانش وری کے اس عمل میں بڑی حد تک شریک ہوتے ہیں۔ ایسے منصوبے دراصل ان علمی اصولوں کی جو اپنے اندر ایک عموم رکھتے ہوں، اطلاقی شکل ہوتے ہیں۔

ہر معاشرے کے اپنے دانش ور ہوتے ہیں۔ قدیم معاشرے بھی اپنے مجموعی علم کی مناسبت سے دانش وروں کی 'تخلیقی' فکر سے فائدہ حاصل کرتے تھے۔ ماضی کی عظیم مشرقی اور مغربی سلطنتوں میں بھی 'سیاسی بصیرت' اور 'الہامی' ہدایت کی روشنی میں معاشروں کو وہ تخلیقی فکر فراہم ہوتی رہی ہے جس کی مدد سے وہ عالمی طاقتیں بن سکیں۔ دانش وری کی اس روایت میں تخصص معاشرتی ارتقا کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتا رہا، یہاں تک کہ زمانہ جدید میں ریاستی ذمہ داریاں اب مختلف اقسام کی دانش کی متقاضی ہوگئی ہیں۔ اب معاشروں کو چلانے کے لیے قانون، معاشیات، شماریات اور نظم ونسق کے ماہرین کی ضرورت ہوتی ہے جو اگرچہ راست طور پر ریاضیات، ادب عالیہ، فلسفہ اور تاریخ سے متعلق نہیں ہوتے، لیکن بالواسطہ ان مضامین سے ایک درونی قوت حاصل کرتے ہیں۔ جدید معاشرہ کے بعض ادارے نسبتاً اونچی سطح کی دانش کے متقاضی ہوتے ہیں مثلاً اعلیٰ عدالتی ادارے، جدید ٹکنالوجی، تجزیاتی صحافت اور ایسے تمام کام جو عمومی اور روزمرہ کے کاموں سے زیادہ فکری صلاحیت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ان میں وہ مناصب بھی شامل ہو جاتے ہیں جو معاشروں میں ایسی اونچی سطح کے انتظامی امور سے متعلق ہوتے ہیں جہاں سوچ کو گھے بندھے ضابطوں سے ماورا جانے کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔

آگے بڑھنے سے قبل چند لفظ 'روایت' اور 'دانش وری' کے بارے میں۔ یہاں میں روایت کا لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں کر رہا ہوں جن معنوں میں فرتھیوف شون (Frithof Schoun) رینی گینوں (Rene Gennon) اور حسین نصر نے استعمال کیا تھا یا پاکستان میں حسن عسکری اور سلیم احمد جس کے نمائندے تھے۔ یہ دانش وری کی ایک علیحدہ روایت ہے، جو

روحانیت کی ایک مسلسل جہت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ہمارے سیاق میں روایت سے مراد کسی تہذیب کے وہ عناصر ہیں جو بدلتے ہوئے تہذیبی مظاہر میں اپنی ایک وحدت کو قائم رکھتے ہیں۔ دانش وری کے مختلف اظہار کم و بیش ایک روایتی پیراڈائم کے پس منظر میں ہی ممکن ہوتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات کسی روایت میں تبدیلی کا سبب بھی بن سکتے ہیں۔ دانش وری کی ذمہ داریوں کو سمجھنے کے لیے اس کے پس منظر کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ تاریخی طور پر اس بات کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ مذہبی دانش وری ازمنہء وسطیٰ میں ایک خاص پیراڈائم کے اندر مذہب کے تقدیسی عناصر کی تفہیم پر مشتمل تھی جو الہامی کلام کی تعبیر و تشریح اور ایمانیات کی صداقت اور حقانیت پر عقلی آمادگی کی شکل میں ظاہر ہوتی تھی۔ بدھ مت، ہندو مت، عیسائیت، یہودیت اور اسلام اپنے اپنے تعبیری اختلافات کے باوجود ایک وسیع روایت سے پیوستہ تھے۔ تعبیر کے اختلاف کے تحت مختلف مذاہب فرقوں کے وجود میں آ جانے کے باوجود وہ ایک ہی روایت سے منسلک رہے اور بڑی حد تک اپنے مذہب کی بنیادی تعلیم سے اپنا تعلق قائم رکھے رہے۔ دراصل فرقوں کی اصطلاح، کسی مذہب کی اسی درونی صفت کا اظہار ہے کہ وہ تعبیری اختلاف برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور صرف بصورت اضطراری فرقوں کو اپنے سے جدا کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ اسفل درجہ کی فرقہ وارانہ دانش وری اگرچہ مرکز گریزی پر مائل کرتی ہے لیکن اعلیٰ دانش وری ہمیشہ ایک مرکزی میلان رکھتی ہے اور وہ تعبیری اختلافات کو برداشت پیدا کرنے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے۔

روایت سے منسلک رہنے کے ایک اور معنی بھی ہیں، جو دانش کے میدان کار سے متعلق ہیں۔ مثلاً فلسفہ، لٹریچر، اور آرٹ میں کسی روایت کی پاسداری اس قدر ضروری نہیں اور اکثر تخلیقی رجحان رکھنے والوں نے ایک ہی زمانہ میں کئی روایتوں کو رد کیا ہے اور نئی روایتوں کی بنیاد ڈالی ہے۔ لیکن سائنس کے میدان میں ایک بڑی روایت (Paradigm) کی پاسداری اس لیے ضروری ہے کہ سائنسی مضامین کا صدق اور کذب بڑی حد تک وہ روایت متعین کرتی ہے جس میں سائنس دان کام کرتا ہے، تا آنکہ کسی زمانہ میں سائنسی تحقیقات کلی طور پر اس روایت سے ماورا ہو کر ایک نیا پیراڈائم تشکیل دیں۔

ازمنہء وسطیٰ میں سائنسی علم کی صداقت یا کذب عیسوی چرچ طے کرتا تھا جو بعض قضایا

کو حقیقت کائنات سمجھ کر، استخراجی منطق کے ذریعہ نئے انکشافات پر قضایا سے مطابقت یا عدم مطابقت کی بنیاد پر حکم لگاتا تھا۔ کوپرنیکس، گلیلیو اور اسی قبیل کے دوسرے سائنس دان اسی لیے گردن زدنی قرار دیے گئے کہ ان کے انکشافات، کلیسا کی حقیقت متعینہ سے مغائرت رکھتے تھے۔ بالآخر سائنسی حقائق کی ناگزیریت نے ایک نئے سائنسی پیراڈائم کو جنم دے کر سائنسی علم کو مذہب کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اور اپنے اور مذہب کے دائرہ کار کی علیحدہ علیحدہ حد بندی کر دی۔ دانش وری کی یہ تاریخی تفہیم اس لیے ضروری ہے کہ اگر ہم نے دانش کے مختلف دائرہ کار میں فرق ملحوظ خاطر نہ رکھا اور سب کو ایک ہی منطق کے سانچے میں ڈھالنا چاہا، تو ہم فکری انتشار، اور تضاد یا ایک قسم کی پاپائیت کا شکار ہو سکتے ہیں۔

اب چند باتیں دانش وروں کی ذمہ داریوں، یا کام کے بارے میں۔ دانش وری ایک سنجیدہ اور محنت طلب کام ہے جو روزمرہ کے اخبار اور رسالے پڑھ کر ٹیلیویژن اور ریڈیو پر دانش ورانہ خیالات ظاہر کر دینے سے پورا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس قسم کی صحافیانہ گفتگو اور دانش کے مابین ایک قسم کا تناقض پایا جاتا ہے۔ دانش کا اظہار صحافیانہ طرز بیان سے مناسبت نہیں رکھتا۔ اور نہ جذباتی اپیل اور کٹ حجتی سے میل کھاتا ہے۔ وہ کلیشے اور نعرہ بازی سے بھی اجتناب کرتا ہے اور انسانی عقائد اور افادیت سے قطع نظر دلیل کی حجت کو تسلیم کرتا ہے۔ دلیل سے یہاں مراد وہ علمی پیراڈائم ہے جس میں رہ کر گفتگو با معنی بھی ہوتی ہے اور مناسب (Relevant) بھی۔ دانش ور کا بنیادی کام ایسا مواد فراہم کرنا ہے جو علم میں مجموعی طور پر اضافہ یا ترمیم کرے یا کسی علمی موقف کو غلط ثابت کرے۔ دوسرے الفاظ میں دانش وری پرانی روایت یا علم کو دہرانے کا نام نہیں ہے بلکہ اس علم کی کسی نئی جہت کی تلاش، علمی اثاثہ سے نئے خیالات کا استخراج، پرانے علم کی نئے تصورات سے مطابقت یا عدم مطابقت، یا زندگی گزارنے کے ایسے اصول وضوابط فراہم کرنا جن کی مدد سے انسان مجموعی طور پر ایک خیر کی زندگی گزار سکے۔ دوسرے الفاظ میں دانش وری کا کام ایک اعلیٰ ثقافت (High Culure) کی تخلیق ہے جو معاشرہ میں رہنما اصول کے طور پر کام کر سکے۔

میرے کہنے کا منشا یہ نہیں ہے کہ دانش وری علوم میں حک واضافہ کا ہی نام ہے اور اس سے کم تر درجہ کے کام کرنے والے دانش وری کے دائرہ سے خارج ہو جاتے ہیں۔ کسی بھی تخلیقی فکر

کے سامنے آنے پر اس کی تشریح، تعبیر، تنقید اور تفہیم سب ہی دانش کے زمرہ میں شامل ہیں۔ بڑے بڑے مفکروں کے بعد ان کے متبعین کا ایک لمبا سلسلہ چلتا ہے، جو فکر کے بعض مخفی گوشوں سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ یا کم نمایاں پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں یا اس فکر کو، بعض تضادات دور کر کے، ایک منضبط نظام کی تشکیل میں مرتب کرنے کے کام میں شامل ہوتے ہیں۔ بحث و تمحیص اور تنقید و تفہیم کے تمام کام دانش ور ہی سرانجام دیتے ہیں اور اس طرح ایک اعلیٰ ثقافت سے علم کی ایک مجموعی کلچر پیدا ہو جاتی ہے۔ سائنس کے میدان میں دانش وری زیادہ تر علم کی وسعت اور پھیلاؤ کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک تجزیاتی اصول کے معلوم ہو جانے کے بعد اس کے اطلاق کا عموم بڑھانے میں جو سائنس داں اپنے اپنے معمل خانوں میں مصروف کار ہوتے ہیں، یا کسی عامل کی اثر پذیری اور وسعت کا جائزہ لیتے ہیں اگرچہ وہ کوئی اعلیٰ ثقافتی کلچر کی تخلیق میں مصروف نہیں ہوتے لیکن پھر بھی دانش وری کی ثقافت کے قیام اور پھیلاؤ میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

دانش وری کا فطری رجحان وطنی، قومی اور لسانی حدود سے وسیع تر ہوتا ہے اور اس طرح وہ عالمگیر طریقے پر ایک معیار کی شکل اختیار کر لیتی ہے جو ملکی سطحوں سے ماورا ہوتا ہے۔ دانش وری کی اعلیٰ ثقافتیں اس وجہ سے دوسری تہذیبوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ سلطنت روما کے دانش ور، یونانی حکمت سے مستفید ہوتے تھے۔ اسی طرح اسلامی تہذیب یونان، روم اور دوسری تہذیبوں کی حکمت سے استفادہ کر کے، ایک بڑے ترقی یافتہ معاشرہ کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد مغربی فکر نے اپنے دائرے سے باہر نکل کر تمام دنیا کی فکر کو متاثر کیا۔ انیسویں صدی کے جرمن مفکرین نے دانش کے عالمی معیار متعین کرنے میں مدد کی، اسی طرح معاشی ترقی کے جدید ماڈل تمام دنیا کو متاثر کر رہے ہیں۔ چونکہ عقل کے سانچے کم و بیش عالمگیر ہوتے ہیں اس لیے دانش کی کوئی سرحد نہیں ہوتی، اور اس میں عالمگیر طور پر قبول کیے جانے کی ایک فطری صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ یہ فطری صلاحیت اس عقلی نظام پر مبنی ہوتی ہے جو تمام انسانوں کے لیے یکساں طور پر قابل قبول ہو سکتا ہے۔ یونانی منطق نے جس طرح مذہبی تہذیبوں میں قانونی اور اخلاقی نظاموں کی تدوین میں مدد کی وہ اسی لیے ممکن ہوئی کہ یونانی منطق کے اصول فکر ہمہ گیر نوعیت کے تھے۔

اور ہیگل (Hegel) سے پہلے کوئی ان کے عالمگیر اطلاق پر شک بھی نہیں کر سکتا تھا۔ آج بھی عقلی مقدمات جس حد تک عالمگیر ہوتے ہیں اسی حد تک تہذیبی نفوذ اور اثر پذیری کا باعث بنتے ہیں۔ مذہبی بنیاد پر نظام زندگی کی تشکیل میں کمزوری پیدا ہونے کی بڑی وجہ مذہبی عقائد کی منطقی ہمہ گیریت میں کمی ہو جانے سے پیدا ہوئی ہے۔ جدید فکری اصول مذہبی عقائد کے شخصی اور ذاتی ہونے کی حد تک معترض نہیں ہوتے البتہ ان کے ہمہ گیر اطلاق کو دوسروں کے ذاتی عقائد میں مداخلت تصور کرتے ہیں۔ مذہبی دانش وری کو اب ایسی جدید منطق یا فکری اصول درکار ہیں جو مذاہب کی اخلاقی قوت کو تو برقرار رکھیں لیکن کسی عقیدہ کے تسلط کے لیے محض ادعایت کے جبر کو استعمال نہ کریں۔ اخلاقی قوت کو برقرار رکھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ معاشرتی بقا کی ضمانت ہے۔ اخلاقی اقدار وہ اقل ترین اصول فراہم کرتی ہیں جن کے بغیر انسان کی اجتماعی زندگی محفوظ نہیں رہے گی۔

دانش کی ایک مشترک منطق کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دانش وروں کی آراء میں بھی یکسانیت پائی جانی چاہئے۔ بظاہر یہ بات عجیب لگے گی کہ ایک مشترک عقلی نظام کے ہوتے ہوئے بھی مختلف دانش ور ایک ہی قسم کے نتائج تک کیوں نہیں پہنچتے۔ اگر ایسا ہوتا تو دانش کا ارتقاء رک جاتا۔ لیکن یہ تمام اختلافات مل کر ہی دانش وری کے کلچر کو جنم دیتے ہیں جہاں خیالات کے اختلاف کو سمجھنا، اور برداشت کرنا بھی اسی منطق کا تقاضا ہے جو کسی معاملہ میں دانش ور کو کسی نتیجہ تک پہنچاتی ہے۔

دانش وری اگرچہ معاشرتی چلن پر اثر انداز ہوتی ہے، لیکن معاشرے کلی طور پر دانش وروں کی گرفت میں نہیں ہوتے۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ کسی زمانہ میں صرف ایک ہی دانش معاشروں میں سرایت کیے ہوئے ہو۔ اس میں شک نہیں کہ مختلف زمانوں میں معاشرہ دانش کی نئی نئی قسموں سے روشناس ہوتا ہے۔ خود ایک زمانہ میں بھی وقفہ وقفہ سے الیکشن کے نتیجہ یا حکومت کی تبدیلی سے معاشروں میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے اور دانش وری کا سیاسی رول زمانہ اور حالات کے تقاضوں سے بدلتا رہتا ہے۔ ہابس کا چارلس دوئم، ملٹن کا کرامول، اسکندر اعظم کا ارسطو سے تعلق، اور دوسری جنگ عظیم کے بعد لارڈ کینس (Keynes) کا حکومتی اداروں سے رابطہ، دانش وروں

کے سیاسی رول کی چند مثالیں ہیں۔ اسی طرح ملوک کے درباروں میں علماء اور عقلاء کا مجمع، اکبر کے نورتن، اور موجودہ زمانے کے فکری ادارے جو حکومتوں اور سیاست دانوں کے لیے تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں اور رہنما پالیسیاں بناتے ہیں دانش وروں کے سیاسی یا سماجی رول کے قریبی تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔ نظریاتی مملکتوں میں کارل مارکس اور اینجلز کا رول بھی معاشروں میں سیاسی اور معاشی نظاموں کی تشکیل میں مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں آج کل نظریۂ پاکستان کے نام پر جو دانش وری ہو رہی ہے وہ دانش وری کے سیاسی رول کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ معاشروں میں دانش وروں کے سیاسی رول کے سلسلے میں فیصلہ کن بات یہ ہوتی ہے کہ دانش ور صحیح معنوں میں عمل دانش میں مشغول ہے یا کسی فکر، نظریہ یا سیاسی پارٹی کے لیے جواز تلاش کرنے میں۔ دوسرے عمل کو دانش وری سے موسوم کرنا درست نہیں ہوگا۔

دانش وری اور سیاسی اثر پذیری میں حد فاصل قائم کرنا کسی قدر مشکل کام ہے۔ کسی بھی بڑے پروجیکٹ پر کام کے لیے دانش وری کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس پروجیکٹ کو قومی منصوبہ بندی کا حصہ بنانے میں وہ لوگ شامل نہیں ہوتے جو اپنی دانش کے بل پر اس کو کامیابی سے ہمکنار کر سکتے ہیں۔ یہاں سیاسی عمل اور دانش ور کی کوشش میں فرق قائم کرنا دقت طلب ہو سکتا ہے۔ عام طور پر جب کوئی دانش مند کسی حکومت کی ملازمت اختیار کرتا ہے تو اس کو چار و ناچار حکومتی اقدامات کی حمایت میں اپنی دانش سے کمک پہنچانی ہوتی ہے۔ اگر یہ کام اس کی بے لاگ دانش کے خلاف ہے تو یہ دانش کے نہیں بلکہ ملازمت کے زمرے میں آتا ہے اگرچہ اپنی اصل میں وہ دانش ورانہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کسی نہ کسی طور پر، نیت اور محرکات بھی اہل دانش کو ایک دوسرے سے ممیز کرتے ہیں۔

دانش اور دانش وری کے بارے میں اگر یہ عمومی باتیں، بطور مقدمہ ذہن میں رہیں تو پاکستان میں دانش ور اور دانش وری کی کمیت (Quantity) اور ذمہ داریوں کو سمجھنا کسی قدر آسان ہوگا۔ اولاً کمیت یا تعداد کی بات۔ دانش کی تخلیق، تفہیم اور تشخیص کے لیے دانش وروں کی ایک معتد بہ تعداد کی ضرورت ہوتی ہے جو اس عمل میں یک زبان ہوئے بغیر شریک و سہیم ہوں۔ جس طرح ایک چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ اسی طرح کسی معاشرے میں ایک آدھ دانش ور کی

موجودگی، یا اس بات کی آرزو کہ کوئی دانش ور آئے اور قوم کو اس حالت زار سے نجات دے قرین عقل نہیں ہے۔

مسلمانوں میں دانش وری کی روایت کو عربوں، ایرانیوں، شامیوں، ترکوں اور بربروں نے ایک پیچیدہ عقلی عمل کے ذریعہ پروان چڑھایا۔ اس کے باوجود کہ اس میں عربوں کا حصہ بحیثیت قوم اتنا نمایاں نہیں تھا، اس روایت کے اظہار کا ذریعہ ساتویں صدی سے سترھویں صدی تک عربی زبان ہی رہی۔ اس لیے اس کو عربی فکری روایت کہا جا سکتا ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کے ظہور کے بغیر اس روایت کا پروان چڑھنا ممکن نہیں تھا۔ اسلام نے مختلف قوموں کے اہل علم کو ایک روایت سے مربوط کرنے اور اس کو مہمیز دینے میں انسان کی تہذیبی تاریخ میں غالباً سب سے زیادہ نمایاں حصہ ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً ایک ہزار سال تک اسلام سے متاثرہ فکر و فلسفہ دنیا پر حکمرانی کرتا رہا۔ ظاہر ہے کہ متداول علم کے جو مراکز اس وقت قائم تھے ان سے مسلمان دانش وروں نے فائدہ اٹھایا اور سرعت سے پھیلتی اسلامی مملکت نے ان علوم کو خاص طور پر جنم دیا جن کو مملکتی نظام چلانے کے لیے ضرورت تھی۔ اسلام کی کشادہ فکری نے جو کسی پاپائی نظام میں محبوس نہیں تھی ایک علمی رو کو جنم دیا اور قرآن و سنت کی بنیادوں پر ایک علمی عمارت استوار ہونا شروع ہوگئی جس میں مذہبی اور غیر مذہبی تفریق نہیں تھی۔ سائنس، علم تاریخ، علم معاشرت اور علم قانون سب میں ایک مرکزی خیال تو قدر مشترک تھا لیکن ان کے پھلنے پھولنے اور ان میں دوسری تہذیبوں سے اثرات قبول کرنے میں ایک فراخی اسلام کے سبب وجود میں آ گئی۔ سائنس، طب، علم ہیئت قسم کے مضامین اور کس حد تک مابعد الطبعیات، ادب اور شاعری، امراء اور حکمرانوں کی سرپرستی میں پھلتے پھولتے رہے لیکن علوم مذہبی میں فکری آزادی جلد ہی تقلید کا شکار ہو گئی۔ مستعبد امر یہ ہے کہ جو فکر اذہان کو کھولتی ہے اور نئی راہیں تلاش کرنے کے لیے مہمیز کا کام کرتی ہے اسی کو فکر نو کے راستے میں ایک حربہ کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اس کی یقیناً تاریخی وجوہات ہیں۔ مسلمانوں کی سرعت سے پھیلتے ہوئے معاشرہ میں اس بات کا خطرہ پیدا ہوا کہ اگر اسلام کی تفہیم کے بارے میں آزادی فکر کو دخل انداز ہونے کا موقع ملا تو اسلامی تشخص کو نقصان پہنچے گا اور امت مسلمہ تفریق اور انتشار کا شکار ہو جائے گی۔ غالباً یہی وجہ

تھی کہ حضرت عثمان ؓ کے حق میں خلافت کے منصب کا فیصلہ اللہ، رسول اور شیخین کی پیروی کے ساتھ مشروط تھا۔

اولین علوم جو مسلمانوں نے زمانی ضرورتوں کے تحت مدون کرنے شروع کیے ان میں قرات، تفسیر اور فقہ شامل تھے۔اسی لیے اسلام کے اولین دانشوروں میں بنیادی طور پر عربی لغت اور تفسیر کے علوم تھے۔ جن کا بنیادی کام قرآن اور حدیث کے متن کا مطالعہ اور اس کی بنیاد پر روزمرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے فقہی مسائل کا استنباط تھا۔ جلد ہی یونانی فلسفہ کے زیر اثر ایک طرف کلامی مسائل پیدا ہوئے اور دوسری طرف یونانی منطق نے قرآن اور حدیث کے متون سے مسائل کے استخراجی طریقہ کو متعارف کرایا۔ استخراجی منطق سے ایک طرف تو فقہی مسائل کے حل کرنے میں مدد ملی اور دوسری طرف کلامی مسائل میں دلیل کا اثر بڑھنا شروع ہوا۔ لیکن جلد ہی کچھ تو سیاسی ضرورتوں کی وجہ سے اور کچھ تشخص کھودینے کے ڈر سے علماء کے گروہ نے آزادیٔ فکر پر پابندی لگانی شروع کردی۔ اور فلسفیوں اور معتزلہ کو صراط مستقیم سے متجاوز پایا جانے لگا۔ بالآخر غزالی کی 'تہافتہ الفلاسفہ' غالب مذہبی رجحان کی ایک مقبول کتاب بن گئی۔

مسلمانوں میں دانش وری کی تاریخ کا یہ اجمالی خاکہ میں نے یہ واضح کرنے کے لیے پیش کیا ہے کہ ابتداء ہی سے دانش وروں کا ایک بڑا طبقہ فکر کو آزادانہ ماحول میں کام کرنے سے مانع رہا ہے۔ اس لیے فکر و فلسفہ کے میدان میں زیادہ سے زیادہ کام اسلامی تصورات کو یونانی فلسفہ کے مطابق سمجھنے اور سمجھانے میں صرف ہوا اور جہاں جہاں اسلامی عقائد کو خطرہ نظر آیا اس کے دفاع کے لیے اسی یونانی فلسفہ سے مدد بھی لی گئی۔ اسی وجہ سے کندی، فارابی، ابن سینا، اور بعد کے آنے والے فلسفی ان معنوں میں نئی راہیں کھولنے والے نہیں تھے جن معنوں میں ان کے حقد مین ارسطو اور افلاطون یا متاخرین میں ڈیکارٹ وغیرہ تھے۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی دانشوری مسلمانوں کو کوئی نیا فکری یا علمی پیراڈائم دینے سے قاصر رہی اور اس کی تقریباً ایک ہزار سال تک ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ لیکن یونانی فکری پیراڈائم میں شرحی اور تفسیری اضافے ضرور کرتی رہی۔

اسلامی دانش وری کی اس روایت میں استثنا، میری دانست میں صرف ابن خلدون

(۱۴۰۶۔۱۳۳۲) ہے جس نے ایک نئے پیراڈائم کی تشکیل کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ فلسفہ تاریخ کا وہ پہلا مفکر ہے جس نے معاشروں میں ہونے والی تاریخی تبدیلیوں کا ایک نظام تشکیل دینے کی کوشش کی ہے۔ اس سے قبل تاریخ نگاری محض واقعات کا ایک ترتیب وار بیان ہوتا تھا جس سے واقعات کے وقوع پذیر ہونے کی کوئی 'علمیاتی' توجیہہ اور تشریح نہیں ملتی تھی اور اگر تھی تو فوق الفطری۔ ابن خلدون کا طریق تفہیم اپنے نہج کے اعتبار سے عقلی، اپنے طریقہ کار کے لحاظ سے تجزیاتی، اور تاریخی واقعات کی تفصیل کے اعتبار سے جامع تھا۔ ابن خلدون معاشروں کے قیام، اور ان میں ارتقاء کی مافوق الفطری یا روحانی توجیہہ پیش نہیں کرتا۔ مذاہب کا قیام یا نبی اور رُسل معاشرتی عمل کے ایک جز کی حیثیت سے تاریخی عمل کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ تاریخی عمل کا ایک فطری عمل ہے اور اس میں تبدیلی کو فطری محرکات سے سمجھا جا سکتا ہے اس طرح تاریخی عمل فطری علم کا حصہ ہے جو شواہد اور دلائل کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے اور اس کے جواز اور عدم جواز کا فیصلہ بھی عقلی شہادت کی روشنی میں ہی ممکن ہے۔ ابن خلدون یونانی فلسفہ اور منطق کے زیر اثر مسلمان مفکروں اور فلاسفہ کی طرح کلامی مسائل سے تعرض نہیں کرتا اور نہ فقہا کی ڈگر پر چل کر مسائل کے استنباط سے غرض رکھتا ہے وہ فطری علوم کی روشنی میں تاریخی ارتقاء اور تہذیبوں کے عروج و زوال کا نیا پیراڈائم دریافت کرنا چاہتا ہے جو اس کے متقدمین نہیں کر سکے تھے۔ وہ پہلا فلسفی ہے جو تاریخی تنقید کے اصول کو استعمال کرتا ہے اس انسان میں موجود داعیات کی روشنی میں جو تہذیبی اور تاریخی عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں، انسان کی سماجی سیاسی اور معاشی زندگی کی تشکیل سے بحث کرتا ہے اور نئے سماجی اور تاریخی علم کی بنیاد رکھتا ہے۔

سولہویں صدی کے آتے آتے مسلمانوں کا فکری انجماد اپنے عروج پر پہنچ گیا، تا آنکہ ثانوی درجہ کی فکر و تحقیق بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر مغربی مفکرین کا طرہ امتیاز بن گئی۔ اس کے بعد استعماری تسلط کی ایک لمبی کہانی ہے۔ اس دور میں مسلمانوں نے محصور ہو کر اپنی روایتوں کی حفاظت کرنے میں عافیت سمجھی اور شہروں سے باہر دیہی علاقوں میں مدارس قائم کر کے دینی ورثہ کی امانت سینوں سے لگا کر بیٹھ رہے۔ دوسری جنگ عظیم کے وقت دنیا کے صرف چار مسلمان ممالک استعماری قبضہ سے آزاد تھے۔ لیکن مغربی فکر نے دنیا کے تمام ملکوں میں بشمول آزاد ملکوں

کے اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔ دراصل دنیا کے بدلتے ہوئے حالات سائنسی اکتشافات، اور کائنات کے مطالعہ کے لیے نئی نئی راہیں کھل جانے کی وجہ سے جو نیا علمی پیراڈائم سولہویں صدی سے شروع ہوا اس کے زیر اثر پرانے علمی ذخیرہ کو تنقیدی نظر سے پرکھنے کی ضرورت تھی۔ مسلمانوں نے خود مکتفی ہونے کے احساس کے سبب اور تقریباً ہزار سال تک دنیا پر اپنا تسلط قائم رہنے کی زعم میں اس ضرورت کا سرے سے انکار کر دیا کہ پرانا علم بھی انسان کی نئی عقلی یافت کے معیارات کے تحت جانچا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کا رجحان اس جانب بڑھنے والے ہر شخص کو قابل گردن زدنی قرار دینے میں بڑا سریع رفتار تھا۔ لیکن مغربی استعمار سے اگر ایک طرف مسلمان مملکتوں نے آزادی جیسی نعمت کو کھو یا وہاں اس کو یہ موقع بھی میسر آیا کہ وہ علم کی نئی روشنی سے مستفید ہو سکیں گو دوسری اقوام عالم کے مقابل میں انہوں نے بہت دیر سے، اور بہت لرزاں و ترساں اس طرف پیش قدمی کی۔ برصغیر ہندو پاکستان کی حد تک سرسید وہ پہلے شخص تھے جنہیں اس ضرورت کا احساس ہوا، اور اُس وقت چونکہ سیاسی اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ سے جا چکا تھا اسی لیے سیاسی قوت سے گزند پہنچنے کے ڈر سے بے غم ہو کر انہوں نے نئے علوم کی روشنی میں مسلمانوں کے معتقدات اور عقائدی نظام کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

سرسید نے گلیلیو (Galileo Galilei 1564 - 1642) کے اس نظریہ کو قبول کر لیا کہ بائبل کی آیات سائنسی میدان میں حکم کے طور پر استعمال نہیں ہو سکیں اور جہاں بائبل اور سائنس میں اختلاف نظر آئے اس کی سائنسی طریقے پر تعبیر کی جانی چاہیے۔ سرسید کا پیراڈائم، گلیلیو کے بعد وجود میں آنے والی سائنسیت (Scienticism) کے فلسفہ پر مبنی تھا جو انیسویں صدی میں مغرب کی مقبول فکر بن چکا تھا۔ اس فکر کے نتیجہ میں ایک نئے علم کی داغ بیل پڑی جس کو عمرانیات سائنس (Sociology of Science) کہا جانے لگا۔ یہ علم فلسفیانہ، مذہبی، نظریاتی اور جمالیاتی تصورات کی تفہیم پر سائنسی طریقہ کار کے اطلاق کا خواہش مند تھا، فطری واقعات کی فطری طور پر توجیہہ ہو سکتی ہے اور مذہبی کتابوں میں فطری حادثات، مثلاً سیلاب اور زلزلوں کے جو اسباب بیان کیے گئے ہیں وہ واقعاتی اعتبار سے قابل اعتنا نہیں ہیں۔ اسی طرح ڈارون کا نظریہ ارتقاء، سائنسی طریقہ آفرینش انسان کو عقلی طور پر سمجھا سکتا ہے۔ سرسید نے

یورپی دانش وروں کے اتباع میں فطرت کے بارے میں سائنسی توجیہات کے نقطہ نظر کو تسلیم کیا۔ لیکن قرآن کی حقانیت اور ابدی صداقت کے ذہن اجتماعی میں پیوست تصور سے نبرد آزما ہونے کے لیے ان کو بعض آیات کے مطالب، سائنسی انداز میں بیان کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ مذہب اور سائنس کے تضاد کے تصور سے بچا جا سکے۔ لیکن یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے۔ سائنسی طریقہ کار اور سائنسی طرز تشریح سائنسی میدان میں تو قابل تشفی ہو سکتے ہیں لیکن علم عمرانیات یا مذہبی تصورات کے لیے اس قسم کی تشریعاتی (Nomological) تشریح ایک تقریباً ناممکن عمل ہے۔ معجزات، جن یا ملائکہ کے بارے میں تشریحات کو مروجہ مذہبی دانش نے نیچری قرار دے کر سر سید احمد خاں کی فطرت کی تفہیم کو یکسر رد کر دیا لیکن خود کو ایک بڑے فکری مغالطہ سے بچا نہ سکی اور وہ یہ کہ سائنسی تحقیق کی بنیادی تفہیم کے علی الرغم، سائنسی انکشافات کو مذہبی تصورات کا اسی طرح موید سمجھ لیا جس طرح ان کے پیش رووں نے یونانی منطق کو ابدی دانش سمجھ کر سلسلہ اسباب کے تصور سے خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ انسان کے موجودہ سائنسی ذرائع سے چاند یا مریخ پر پہنچنے سے حضور اکرم ﷺ کا معراج کا واقعہ ثابت کرنے کی کوشش، سائنس اور مذہب سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ جس کو عوامی سفسطہ (Sophistry) کے طور پر تو استعمال کی جا سکتا ہے لیکن دانش کے میدان میں ایک جاہلانہ دعویٰ ہے۔

سر سید کے سائنسی نقطہ نظر کی دلیل اسی ادعائی منطق پر مبنی تھی جو مذہبی دانش نے اختیار کر رکھی تھی۔ یعنی یہ کہ خدا کے کاموں میں تضاد ممکن نہیں ہے، اور چونکہ فطرت خدا کی تخلیق ہے، اور قرآن خدا کا کلام اس لیے ان دونوں میں بھی تضاد ممکن نہیں۔ لیکن اس بظاہر تضاد سے نکلنے کی کیا صورت ممکن ہے۔ ایک تو وہ تھی جو عیسائی اور یہودی دانش نے استعمال کی یعنی یہ کہ مذہبی مکالمہ کو سائنس تفہیم سے خارج کر دیا۔ اب اگر کوئی معجزہ، سیلاب اور زلزلہ کو خدائی دخل اندازی سمجھتا ہے تو یہ اس کا ذاتی مسئلہ ہے۔ سائنس اس کے ذاتی مسائل کو حل کرنے کی کوئی کوشش کرنا پسند نہیں کرے گی۔ مغرب کا طریق کار ایک سیدھا آپریشن تھا جس نے بیک جنبش مسئلہ کو حل کرنے کی بجائے اس کو سرے سے ختم کر دیا۔ خوش قسمتی سے قرآن میں بائبل کی طرح بہت کم اس قسم کی آیات ہیں جو فطری مظاہر کو مسلسل خدائی دراندازی سے تعبیر کرتی ہوں اور قرآن کا

مجموعی تصور کائنات فطری سلسلہ اسباب کی عملداری کو قبول کرتا ہے۔ اور خدا کو ایک ماورا قوت کے طور پر جو کائناتی تسلسل کا منبع ہے تسلیم کرتا ہے۔ لیکن مذہبی دانش وری کی اذعانی منطق کا جزئیات پر زور مغرب کے انداز میں مسئلہ کو حل نہیں کر سکتا۔ اسی لیے سرسید کو کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر فرشتوں، جنوں اور معجزات کی فطری قوانین کے تحت تشریح کرنی ضروری ٹھہری۔ نتیجتاً سرسید کے چند متبعین اس سائنسی دانش وری کا کوئی ایسا مستقل سلسلہ پیدا نہ کر سکے جو مذہبی دانش کی ادعائیت کے سامنے ٹھہر سکے۔

سرسید کی مذہبی تفہیم کے پیراڈائم سے جو اعتقادی مسائل پیدا ہوئے مذہبی دانش ان کو فکر کا ایک حاشیہ سمجھ کر غالباً نظر انداز کر دیتی لیکن سرسید کا منشا صرف ایک فکری عمل سے پورا نہیں ہوتا تھا۔ یہ فکری عمل بھی اُن اہم مسائل کے نتیجہ میں پیدا ہوا تھا جو انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستانی مسلمانوں کو درپیش تھے اور جن کا حل سرسید کے نزدیک مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرانا تھا۔ مذہبی ذہن کو یہ سمجھانے کے لیے جدید تعلیم اسلام کے عقائدی نظام سے متضادم نہیں ہے ایک نئی سوچ کی ضرورت تھی جس کو سرسید نے پورا کرنے کی کوشش کی۔ تعلیم کی ایک نئی پبلک پالیسی اختیار کرنے کی یہ کوشش سرسید کی مساعی سے کامیاب ہوئی لیکن اس خلش کو دور نہ کر سکی جو مذہبی دانش میں معجزات، یا غیر مرئی پر اعتقاد کے بارے میں موجود تھی۔ لیکن ایک عملی روش ضرور وجود میں آ گئی جس کے تحت مغربی تعلیم اور خاص طور پر سائنسی تعلیم اور اسلامی اعتقادی نظام میں کوئی آویزش برقرار نہیں رہی۔

نیاز فتح پوری کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے خاص طور پر سرسید کی فکر کا مطالعہ ضروری ہے اس لیے کہ میری دانست میں دونوں ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں اگرچہ ان دونوں کا بنیادی فرق یہ ہے کہ نیاز فتح پوری کو مافوق الفطری تصورات کی لازماً سائنسی توجیہہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن نیاز فتح پوری تک پہنچنے کے لیے ہم کو درمیان میں ایک اور فکر کو بھی پس منظر میں رکھنا چاہیے اور وہ ہے اقبال کی فکر۔

اقبال نوعی اعتبار سے اپنے پیش رووں سے مختلف ہیں ان کا مسئلہ سائنس اور مذہب میں تطبیق پیدا کرنا نہیں تھا بلکہ مذہب کی حقیقت کو سمجھنا تھا۔ فکرِ اسلامی میں اس نوع کی یہ پہلی

کوشش ہے۔ اقبال کو یہ فائدہ حاصل تھا کہ انہوں نے ہم عصر مغربی فلسفے کا راست طور پر مطالعہ کیا تھا۔ اور حصول علم کے لیے انہوں نے جرمنی اور انگلستان کی درسگاہوں میں متداول فلسفیانہ مباحث سے شناسائی حاصل کی تھی۔ مغرب خود نشاۃ ثانیہ کے بعد مذہبی حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ مغربی مفکرین اور عوام دونوں نے مذہب کو کلی طور پر رد نہیں کیا تھا۔ انہوں نے صرف ریاست کو چلانے کے لیے اس کے عمل دخل کو یہ دیکھ کر ختم کر دیا تھا کہ مذہب کی وجہ سے اختلافات زیادہ نمودار ہوتے ہیں اور ریاست کے انتظامی امور مزید پیچیدگیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مغرب نے سو سالہ مذہبی جنگوں سے یہ سبق حاصل کیا کہ اگر مذہب کو انسانی زندگی کے اخلاق اور اطوار سدھارنے کا ایک وسیلہ بنایا جائے تو یہ زیادہ بہتر ہے اس لیے کہ ریاستی امور میں مذہب کی مداخلت عقائدی جنگوں کا سبب بنتی ہے۔ سرسید اور نیاز دونوں اس نقطہ نظر سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ اقبال کی اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے مذہبی احساس کو ایک تخلیقی قوت کے طور پر تسلیم کیا ہے جو انسانی زندگی میں رواں دواں ہے۔ اس کا ایک لازمی نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ ان آفاقی اقدار کو تسلیم کرنے کے بعد جو مختلف مذاہب میں مشترک ہیں ان کی بنیاد پر انسانی زندگی کو ان اقدار کے مطابق ڈھالنے کے لیے طور طریقے وضع کرنے کی ضرورت کی حد تک آزادی حاصل ہونی چاہیے تھی۔ لیکن میری دانست میں اقبال کو، اگر چہ وہ یہ کام کرنا چاہتے تھے، یہ موقع نہیں ملا کہ وہ اس تصور کو عملی جامع پہناتے۔ لیکن یہ ایک اہم اور علیحدہ مسئلہ ہے اور اس پر گفتگو کسی اور موقع پر کی جا سکتی ہے۔ یہاں پر میرا منشاء صرف اس قدر ہے کہ سرسید اور اقبال دونوں نے اسلامی فکر میں جو اضطراب پیدا کیا تھا اور جو سوال اٹھائے تھے ان کی صدائے بازگشت بعد کے آنے والوں میں کسی نہ کسی نوعیت سے سنی جا سکتی ہے۔ نیاز فتح پوری انہی متاخرین میں ایک اہم دانشور ہیں۔ ان کو ایک طور پر بیسویں صدی کے ایک دوسرے مفکر ابوالاعلیٰ مودودی کا استاد بھی کہا جا سکتا ہے اس لیے کہ ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے بھائی ابوالخیر مودودی کے ساتھ طرز انشاء کی ابتدائی تربیت نیاز فتح پوری سے ہی حاصل کی تھی۔

نیاز فتح پوری کے سامنے سرسید اور اقبال دونوں موجود تھے۔ انہوں نے دونوں سے استفادہ کیا اور ان دو غلطیوں کو نہیں دہرایا جو سرسید اور اقبال سے سرزد ہوئی تھیں۔ سرسید کی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے مذہبی مائیتھالوجی (Mythology) کی سائنسی توجیہہ پیش کرنا شروع کر دی

اور اقبال کی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے انسانوں کی تخلیقی قوت کا سراغ لگانے کے باوجود مذہبی معاملات اور قوانین کو بحیثیت مجموعی روایتی طور پر قبول کر لیا جس کے وہ ابتدا میں شاکی نظر آتے ہیں۔

نیاز فتح پوری بے شک کوئی (Original) مفکر نہیں ہیں۔ لیکن ایک ذہین دانش جو کی طرح وہ اس غلطی کے مرتکب نہیں ہوئے جس کے مرتکب ان کے ہم عصر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ہوئے تھے۔ نیاز فتح پوری کی طرح ابوالاعلیٰ مودودی کو بھی مغربی فکر و فلسفہ سے روشناسی حاصل تھی نیاز فتح پوری اس فکر سے متاثر تو ہوئے لیکن انہوں نے مذہب کو ان فکری سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کی جس کے مرتکب مولانا مودودی ہوئے۔ ان دونوں حضرات کی دانست میں ہم عصر مغربی فکر سے آیا ہوا قومیت، اور آئیڈیالوجی کا تصور معاشرتی انجینرنگ کے لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ نیاز فتح پوری نے مذہب کو آئیڈیالوجی میں تبدیل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور اس کو انسانی زندگی کا ایک اہم ترین جز ماننے کے باوجود ان معنی میں نظام حیات نہیں بنایا جن معنوں میں مولانا مودودی نے بنانے کی کوشش کی۔ نیاز فتح پوری کے نزدیک اسلام کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی قوانین اخلاقی اقدار کی نمائندگی کرتے تھے اور عصری ضرورتوں کے تحت ان میں ترمیم و تنسیخ ممکن تھی۔ اس لیے کوئی آئیڈیالوجی مستقل بالذات مذہبی قدر کے طور پر قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے برعکس مولانا مودودی کے نزدیک یہ سیاسی اور سماجی اصول مستقل بالذات غیر متبدل اصول تھے۔ مولانا مودودی کی فکر نے اسلام کی تفہیم میں جدیدیت تو ضرور پیدا کی کہ لوگ اس کو مارکسزم کے طور پر ایک آئیڈیولوجی سمجھیں اور اس کو قائم کرنا اپنا فرض منصبی جانیں۔ لیکن مذہب کے دائرہ کو اجتماعی اظہار کی ایک ڈرل تک محدود کر دیا۔ نیاز فتح پوری کے نزدیک انسانی زندگی میں خدا کا مقام آئیڈیولوجی کے خالق کی حیثیت سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے۔ خدا بنیادی طور پر انسانی زندگی کے لیے وہ اخلاقی بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ جس کے بغیر زندگی مادہ پرستی اور نفع اندوزی کا شکار ہو جاتی ہے۔ خدا انسان کو ایسی حقیقت سے بھی روشناس کراتا ہے جو بنیادی طور پر روحانی کہی جا سکتی ہے۔ مذہبی حقائق اگر انسانی زندگی میں سرائیت کر جائیں تو معاشروں کے حسن کا باعث بنتے ہیں اور اگر یہ غائب ہو جائیں تو معاشروں میں ظلم، بے انصافی اور خود غرضی جگہ بنا لیتی ہے۔ میری دانست میں نیاز فتح پوری کی یہ مذہبی تفہیم نہ صرف یہ کہ آج کی ہم عصر فکر سے مطابقت رکھتی

ہے بلکہ اس میں یہ گنجائش بھی موجود ہے کہ اس کو عالمگیر حقیقت اور مسلک قرار دیا جا سکے، جو اخوت عامہ، اور انسانیت کبریٰ کو منزل حقیقی قرار دے کر ساری دنیا کے لیے ایک مشترک لائحہ عمل بن سکے۔

نیاز فتح پوری اس دور میں ایک ایسے پل کا کام کر سکتے ہیں جو مذہبی تفہیم اور ہم عصر فکری تقاضوں کو ایک تصادم سے بچانے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ اس فکر کو ''تجدد کا پایہ چوبیں'' سمجھنا ایک طنز تو ہو سکتا ہے لیکن حقائق سے بہت دور ہے۔ جن لوگوں نے نیاز فتح پوری کو متجدد ہونے کا طعنہ دیا ہے ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جدیدیت ایک بڑے وسیع اور فکری نقطہ نظر کا نام ہے۔ جس کی بنیادیں سولہویں صدی کے بعد مختلف النوع مفکرین نے اٹھائی ہیں۔ ان مفکرین میں مادیت کے علمبردار بھی تھے اور تصوریت کے بھی، روحانی اقدار کو ماننے والے بھی تھے اور انسانی نظام کو ایک کلی تفنع اندوزی سمجھنے والے بھی۔ لیکن ان تمام مفکرین میں سے بیشتر مذہب کو چھوڑنے کی بجائے اس کی ایک نئی تفہیم کی طرف راغب ہونا چاہتے تھے اور انسانی زندگی میں مذہب کو غیر اہم سمجھ کر اس کو نظر انداز کرنے کے قائل نہیں تھے۔ میری دانست میں نیاز فتح پوری اُس سلسلہ فکر کی کڑی ہیں جو اگرچہ کسی فلسفیانہ فکر کے بانی نہیں ہیں لیکن مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کسی فکر کو محض اس لیے رد نہ کریں کہ یہ غیروں کی طرف سے آئی ہے۔ انسانوں کی علمی میراث میں اپنے اور پرائے کو دیکھنا کوئی معقول رویہ نہیں ہے۔ یہ ایک مشترک میراث ہے۔ جس سے مختلف نقطہ ہائے نظر رکھنے والے اپنے اپنے طور پر استفادہ کر سکتے ہیں۔ نیاز فتح پوری کی اہمیت اس لیے دور حاضر میں زیادہ ہے کہ وہ کوئی ''نظام'' دینے کی بجائے ایک نہج اور طریقہ کار کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ نہیں تھا کہ ایک خاص فلسفہ یا ایک خاص نقطہ نظر مابعد الطبعیاتی لحاظ سے اٹل عالمگیر ہے بلکہ صرف یہ تھا کہ انسان اپنی زندگی میں اپنے مسائل کے حل کے لیے علمی اور عقلی طریقہ کار اختیار کرے۔ جدید فلسفہ کا رجحان بھی مابعد الطبعیاتی سے زیادہ علمیاتی ہے۔

نیاز فتح پوری نے میری دانست میں ایک اور اہم تفریق مذہبی حقائق کو سمجھنے میں ملحوظ خاطر رکھی ہے اور وہ مذہب کے عقائدی نظام اور مذہب کی اصل روح کے مابین ہے۔ عقائدی نظام انسانی فکر کا نتیجہ ہوتے ہیں جن کے متعلق صحت اور عدم صحت کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔ ایمانیات

کے مسائل علمی مسائل نہیں ہیں۔ یہ انسان کے درون اور مذہبی احساس سے متعلق ہیں۔ ایک شخص خدا پر ایمان رکھ سکتا ہے اور بے دلیل بھی رکھ سکتا ہے۔ اور اس کا ایمان ایک علمیاتی قضیہ نہیں ہے۔ البتہ جب وہ خدا کی ماہیت اور نوعیت کے متعلق کوئی حکم صادر کرتا ہے تو یہ حکم چونکہ اس کی اپنی تفہیم کا نتیجہ ہوتا ہے ایمانی قضیہ سے مختلف ہوتا ہے۔ ممکن ہے کوئی شخص خدا کو اس نظام کائنات میں جاری و ساری ایک قوت کے طور پر سمجھتا ہو اور کوئی دوسرا شخص اُس کو مکمل طور پر منزہ سمجھتا ہو۔ یہ دونوں تصورات انسانی تفہیم سے متعلق ہیں اور ان میں اختلاف ممکن ہے۔

نیاز فتح پوری کی دانشوری نے اس نکتہ کو سمجھ کر کبھی ان معاملات میں الجھنے کی کوشش نہیں کی جو عقائدی نظام سے متعلق ہوں اور اگر ان کا رجحان کسی عقائدی نظام کی طرف تھا بھی تو وہ اس کو مذہبی تفہیم کا ایک طریقہ جانتے تھے اور مذہب کا متبادل نہیں سمجھتے تھے۔

جدید مذہبی تفہیم کے پس منظر میں سرسید اور اقبال کے بعد نیاز فتح پوری کا کام اس لیے اہم ہے کہ اس نے عام پڑھے لکھے طبقہ تک رسائی حاصل کی اور ایک ایسا ماحول بنانے میں اپنا کردار ادا کیا جس کی وجہ سے اہل علم کا ایک بڑا طبقہ جدید تفہیم کی اہمیت اور ضرورت محسوس کرنے لگا۔ مولانا مودودی کے رسائل و مسائل کا سلسلہ آپ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک بڑا حصہ اسلام کی روایتی اور مولانا مودودی 'نظام حیات' والی تفہیم سے مطمئن نہیں تھا اور روایتی اور 'نظامی' پیراڈائم کے مقابلہ میں کسی نئے پیراڈائم کا متلاشی تھا۔ اس کام کو زیادہ تر بیسویں صدی کے اواخر میں مسلمانوں کے ڈائسپورا (Dispora) نے کرنے کی کوشش کی ہے۔ پاکستان میں کچھ دوسرے عوامل کی وجہ سے اسلام صرف 'روایتی' اور 'نظامی' شکلوں میں اپنا نفوذ پیدا کرسکا۔ البتہ سیاسی اور معاشی ملک بدری کی وجہ سے جو مسلمان ترقی یافتہ ممالک میں پیدا یا آباد ہوئے ان کو اسلامی تشخص سے دستبرداری یا روایتی اور 'نظامی' اسلام دونوں میں سے کسی کو قبول کرنا معقول رویہ نہیں معلوم ہوتا۔ تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ اس خود تنقیدی کے عمل کی ابتدا ہوتی معلوم ہو رہی ہے جس کے نتیجے میں مسلمان دانش وروں کو تاریخ اور عقائد پر دوبارہ غور و خوض کی ضرورت کا احساس ہو رہا ہے۔ برصغیر کی حد تک یہ سب اسی فکری لہر کا نتیجہ ہے۔ جس کی ابتدا سرسید سے ہوئی اور جو اقبال، نیاز فتح پوری اور مودودی کے واسطے سے ایک نئی سمت پر آگے بڑھ [illegible] انجام کا پتہ چلنے میں ابھی کافی وقت باقی ہے۔

حمایت علی شاعر

نیاز صاحب اور نئی نسل

میں جب بھی حضرت نیاز فتح پوری کے بارے میں سوچتا ہوں میرے ذہن میں بہ یک وقت کئی دریچے کھل جاتے ہیں اور میں ایک ایسی فضا میں پہنچ جاتا ہوں جہاں بلندیاں اور وسعتیں اپنی تمام بے کرانیوں کے ساتھ روشن ہوں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اختر الایمان کا یہ مصرعہ میرے اندر سے بول پڑتا ہے۔

کون ستارے چھو سکتا ہے، راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے

نیاز صاحب سے قرب و دوری کا یہ تعلق اس عمر سے ہے جب میں نے ادبی دنیا میں قدم رکھا تھا یہ قیام پاکستان سے پہلے کا زمانہ ہے۔ میری سب سے پہلی تحریر عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج اورنگ آباد کے رسالے "نورس" میں ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی تھی اور اس کا عنوان تھا "فلسفہ اور حقیقت" میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا اور والد کے نام کی رعایت سے "حمایت تراب" کے نام سے ادبی دنیا میں متعارف تھا۔ اس وقت تک میں نے شعر نہیں کہے تھے مگر جو بھی لکھتا اس میں ایک باغیانہ روش ہوتی۔ خاص طور پر "بادشاہت" کے خلاف جو اس وقت تک ریاست حیدر آباد دکن پر مسلط تھی ۱۹۴۶ء میں میری دوسری تحریر بمبئی کے ہفتہ وار رسالے "نظام" میں "تاج کے زیر سایہ" کے عنوان سے چھپی۔ یہ رسالہ قدوس صہبائی ایڈٹ کرتے تھے۔ پھر بمبئی ہی کے رسالے "شاہد" و۔کلی میں "بدلتے زاویے" اور دوسری تحریریں شائع ہوتی رہیں جن کے سبب میں اپنے خاندان میں بہت معتوب تھا۔ بالخصوص میرے والد مجھ سے بہت ناراض رہتے جو ایک پولس افسر تھے پھر کریلا، نیم چڑھا۔۔ میں نے شعر کہنے شروع کر دیے خاندان میں سبھی مولوی تھے جو ہر جمعہ کی نماز سے پہلے خطبے میں خلفائے راشدین کے بعد حضور نظام کی سلامتی کی دعا مانگتے تھے اور انھیں ظل اللہ یعنی خدا کا سایہ سمجھے ہوئے تھے۔ اپنے ہم عمروں اور بزرگوں میں بحیثیت شاعر جب میرا مذاق

اڑایا جانے لگا تو میں نے "شاعر" ہی تخلص کرلیا اور حمایت علی شاعر ہوگیا۔

۱۹۴۷ء میں حیدر آباد دکن کے ماہنامہ "سویرا" میں میری ایک نظم "تقدیر" کے خلاف چھپی جس کے سبب مجھے اپنا آبائی شہر اورنگ آباد چھوڑنا پڑا اور میں حیدر آباد چلا گیا ہندوستان نیا نیا آزاد ہوا تھا۔ ریاست نے بھی اپنی آزادی کا اعلان کردیا تھا۔ میں دکن ریڈیو سے متعلق ہوگیا اور ستمبر ۱۹۴۸ء میں (ریاست کے ختم ہونے کے بعد) آل انڈیا ریڈیو میں بحیثیت اسٹاف آرٹسٹ کام کرنے لگا۔ بنیاد ٹیڑھی پڑچکی تھی تعمیر بھی ٹیڑھی ہوتی گئی۔ ملازمت کے سبب اخبارات و رسائل میں مختلف قلمی ناموں سے لکھتا تھا۔ ابلیس فردوسی، زردوش اور ابن مریم وغیرہ۔ اس دوران غالباً ۱۹۴۹ء میں "شکست الوہیت" کے عنوان سے سٹی کالج کے مشاعرے میں ایک نظم پڑھ دی۔ ہنگامہ ہوگیا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور صدر تھے ان کی سرپرستی حاصل نہ ہوتی تو حشر بہت ہی برا ہوتا۔ پچاس سال پہلے کے اس واقعے کا ذکر "سب رس" (فروری ۲۰۰۰ء) حیدر آباد میں زبیر رضوی (مدیر "ذہن جدید" دہلی) نے اپنی یاد داشتوں میں کیا میں نے مزید الجھنوں سے بچنے کی خاطر ایک وضاحتی خط ڈاکٹر مغنی تبسم (مدیر سب رس) کو لکھا جو اس رسالے کے جولائی ۲۰۰۰ شمارے میں شائع ہوا ہے۔ ممکن ہے کچھ احباب کی نظر سے گزرا ہو...

مگر آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ان واقعات کا حضرت نیاز فتح پوری سے کیا تعلق ہے؟ یہیں سے بات کھلتی ہے، یہیں سے راز ملتا ہے۔

ہمارے بزرگوں نے ہمیشہ ہمیں نصیحت کی تھی کہ

خطائے بزرگان گرفتن خطاست

پھر انہیں کی اولاد جب یہ سوچنے لگی۔

ہر کس کہ شد صاحب نظر، دین بزرگان خوش نہ کرد

تو سوچئے کہ الزام کس کے سر جائے گا؟

سرسید تو ہمارے لیے دور کی آواز تھے، علامہ اقبال دل میں بسے ہوتے تھے مگر اس کی زبان شاعرانہ تھی۔ جو تحریریں ہمیں سوچنے پر اکساتی تھیں وہ صرف نیاز صاحب کی تھیں اورنگ آباد میں "نگار" ایک پرانی لائبریری "ادبستان" میں آتا تھا اور

ہم ہر مہینے ہر شمارہ یوں بیتابی سے پڑھتے تھے جیسے آج کل روزانہ اخبار پڑھا جاتا ہے۔ "نگار" میں باب الاستفسار اور مالہ وما علیہ" ہمارے محبوب موضوعات تھے۔ ان صفحات میں جو کچھ سمجھ میں آتا ان پر مہینہ بھر اپنے ہم عمروں میں بحثیں ہوتیں اکثر لڑتے جھگڑتے اور کبھی کبھی اپنے اساتذہ سے بھی الجھ جاتے۔

میرا گھرانہ جیسا کہ میں نے عرض کیا' اپنی دانست میں "علمائے دین" کا گھرانہ تھا' مگر غالب کا یہ مصرعہ بھی ہم پر صادق آتا تھا۔

سو پشت سے ہے پیشہ آباء سپہ گری

ظاہر ہے کہ دونوں اکہرے ذہن تھے۔ ایک مولوی اور ایک سپاہی کے رویے میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ ان کے درمیان میرا جو عالم ہوتا ہوگا آپ اندازہ کرسکتے ہیں مولوی حضرات کے کہنے پر اکثر میری کتابیں پھینک دی گئیں۔ میری تحریریں جلادی گئیں۔ مگر نیاز صاحب کی تحریریں کیسے دل سے محو ہوتیں۔ ان کا نشہ ہی اور تھا۔ دل میں ہزار قسم کے سوالات اٹھتے تھے اور ہم "نگار" میں ان کے جوابات پڑھ کر مطمئن ہوتے رہتے اکثر سوالات ہم خود مختلف ناموں سے لکھ کر بھیج دیتے کہ خدا کی طرح ہمیں اپنے بزرگوں سے بھی بہت ڈر لگتا تھا۔ اور جب "نگار" کے صفحات میں ہمیں اپنے جواب مل جاتا تو "دونوں ڈر" رفتہ رفتہ کم ہونے لگتے۔ بلکہ یہ کہوں تو زیادہ درست ہوگا کہ ہم بزرگوں سے جتنے دور ہوتے جاتے خدا سے اتنے ہی قریب ہونے لگتے۔ ایسے موقعوں پر علامہ اقبال کے اشعار ہمارے بڑے کام آتے۔ ہم اکثر بہ آواز بلند ان کے اشعار پڑھتے کہ ان سے مخالفت کی کس میں ہمت تھی

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق
جو تھا نہیں ہے' جو ہے نہ ہوگا' یہی ہے اک حرف محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ

زمانہ جتنا "قریب تر" کا مشتاق تھا مسلمان اتنے ہی اپنے بعید میں کھوئے ہوئے

تھے۔

ماضی کی طرف دیکھنا اچھی بات ہے مگر تاریخ کی روشنی میں عہد بہ عہد بدلتی ہوئی تہذیبی انداز کی رفاقت میں اس عقل کی رہنمائی میں جس کے سبب ہم اشرف المخلوقات سمجھے جاتے ہیں۔ نیاز صاحب نے ہمیں یہی انداز نظر دیا ہے۔

سرسید تحریک جو دراصل "عقل پسندی" کی تحریک تھی مغربی تعلیم کی برکات کے باوجود اپنی سمتوں میں ایسی الجھی کہ ہندوستان کی "وقتی سیاست" کا شکار ہوگئی اور وہ دھارا جو مسلمانان ہند کو سائنسی آگہی کی منزل تک لے جاتا ہمیں کسی اور ہی سمت لے آیا اور ہم مزید محدود ہو کر رہ گئے۔ غالب کی شاعری میں صدیوں کا جمع شدہ غصہ جو تیور دکھا رہا تھا تصوف کی ہمہ گیری اور ملامیت کے باوجود جب کبھی بھڑک اٹھتا ہے تو نئی نسل کو ایک روشنی بھی دے جاتا ہے نئی نسل نے اکثر اسی آگ سے روشنی پائی اور حالی' اکبر اور شبلی کی طرف دیکھا اور پھر دیر تک علامہ اقبال کی طرف دیکھتی رہی۔

علامہ اقبال پہلے شاعر تھے جنھوں نے مشرقی اور مغربی فلسفوں کا تقابلی اور تنقیدی مطالعہ کیا اور جو نتائج مرتب کیے وہ ہمیں بہت دور تک لے جاتے ہیں اور وہ نکتہ جو سائنسی انداز فکر پر اکساتا ہے' علامہ نیاز فتح پوری کے مباحث پڑھ کر زیادہ سمجھ میں آنے لگا اور ہمیں نیا شعور دینے لگا۔

اکثر ایسے روایتی عقائد جو الہامی کتابوں سے بھی تعلق رکھتے ہیں' نیاز صاحب نے بڑی جرات سے سلجھائے ہیں۔ ان کی حقیقت تاریخی دلائل سے منظم ہو کر قارئین تک پہنچی اور وہ نوجوان جن کا خمیر' بغاوت سے اٹھا تھا انھیں دلائل کو اپنی پیرہنائے رہے۔

میں ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ہائی اسکول کے زمانے کا ہے۔

ہمارے ایک استاد نے ایک دن فرمایا "بقرعید پر جو لوگ جس جانور کی قربانی دیتے ہیں وہ قیامت کے روز اسی جانور پر سوار ہو کر "پل صراط" سے گزریں گے اور "پل صراط" وہ راستہ ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔

بچپن میں قرآن شریف پڑھ لینے کی وجہ سے اتنا مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ بعض

حروف قرآن کریم میں نہیں ہیں۔ میں نے استاد محترم سے کہا کہ مولوی صاحب قرآن شریف میں "پ" تو ہے نہیں۔ یہ "پل" کہاں سے آگیا۔ مولوی صاحب نے خشمگیں نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگے۔ قرآن کتاب الٰہی ہے اس میں سب کچھ ہے کوئی چیز قرآن سے باہر نہیں ہے۔ "پل صراط" بھی اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے اور اس پر سے ہر مسلمان کو گزرنا پڑے گا۔"

ہم نوجوان ان سے کیا بحث کرتے مگر دل میں ایک خلش تھی جو بے چین کیے ہوئے تھی گھر آکر میں نے اپنے ایک بزرگ سے یہی سوال کردیا۔ انھوں نے قربانی کے حوالے سے ایک اور شرط کا اضافہ کردیا۔ کہنے لگے۔ گائے کی قربانی ضروری ہے۔"

"گائے عربستان میں ہوتی ہے؟" میں نے سادگی سے پوچھ لیا۔ "کم بخت قرآن شریف میں سورۂ بقرہ ہے گائے کیسے نہیں ہوگی؟ گائے کی قربانی افضل ہے اگر جنت میں جانا ہے تو گائے کی قربانی کیا کرو"

ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

ایسے کئی مسئلے، صبح و شام ہماری گفتگو کا موضوع بنے رہتے اور نگار اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کرتا۔

"باب الاستفسار" کے علاوہ "مالہ وماعلیہ" کے تحت مختلف شعرا کے کلام کا ناقدانہ تجزیہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے ہم نے ان تجزیوں اور تنقیدوں سے بہت کچھ سیکھا بالخصوص زبان و ادب کی ہم رشتگی اور الفاظ کے برتنے کا قرینہ۔ مجھے یاد ہے ۳۴ء اور ۳۵ء میں ماہنامہ "آج کل" (دہلی) میں جو یعقوب دواشی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا جوش صاحب کی نظم "حرف آخر" قسط وار چھپ رہی تھی۔ خاص طور پر "سینہ عدم میں وجود کا پیچ و تاب" اور "دختران حوا کو کورس" وغیرہ "نگار" میں عرصے تک اس کے اشعار موضوع بحث رہے۔ نیاز صاحب نے جوش صاحب کی زبان دانی کا بھی جائزہ لیا اور غلطیوں اور کوتاہ بیانیوں کی طرف بھی توجہ دلائی۔ اس زمانے میں حضرت جوش پر اعتراض بڑے حوصلے کی بات تھی اور یہ حوصلہ صرف نیاز صاحب ہی کرسکتے تھے۔ وہ تمام بحثیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہم طالب علموں کے لیے ان کا

مطالعہ یوں بہتر ہوا کہ ہم شخصیتوں کے رعب سے نکل گئے۔ نیاز صاحب نے مالہ وماعلیہ کے تحت کے ایسے شعرا پر تنقید کی جو مقبول ہی نہیں اپنے عہد کے بڑے شعرا میں شمار بھی ہوتے تھے۔ مثلاً جگر مراد آبادی' سیماب اکبر آبادی' اثر لکھنوی اور وحشت کلکتوی وغیرہ

یہ تو خیر وہ موضوعات تھے جن کا پابندی سے پڑھنا ہم پر فرض ہوگیا تھا مذہبی سلسلے کے دوسرے مضامین جو من و یزداں' خدا نمبر اور مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ وغیرہ میں شامل ہیں' باضابطہ ہمارے مطالعے میں آتے رہے۔ اور پھر وہ کتابچے بھی جو نیاز صاحب کی مخالفت میں لکھے گئے۔ خاص طور پر شیخ محمد اسحاق صدیقی کا کتابچہ جنھیں نیاز صاحب نے اپنا دوست ہی نہیں بلکہ اپنا شاگرد بھی لکھا ہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ "نگار کا خدا نمبر" نیاز صاحب کی کاوش نہیں ہے۔ یہ سارا کارنامہ اسحاق صاحب کا ہے نیاز صاحب نے صرف نظر ثانی کی تھی۔ واللہ علم۔

مذہبی مسائل پر نیاز صاحب عبدالماجد دریا آبادی اور مولانا سلیمان ندوی کے مباحث بھی کی نظر میں ہیں۔ اور وہ تبصرے بھی جو مختلف مذہبی علمی اور ادبی کتابوں پر نگار میں چھپتے رہے خاص طور پر ڈاکٹر فسلمل کے اعتراضات ...

"نگار" واحد رسالہ تھا جس میں شعر و ادب کے ساتھ ہر علمی موضوع پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ تاریخ' سیاست' معاشیات' مذاہب' نفسیات' لسانیات' فلسفہ' تصوف اور ادب کی تمام اصناف خواہ وہ کسی زبان کے متعلق ہوں "نثری نظم" کے حوالے سے (ستمبر ۱۹۲۴ء کے شمارے میں) "نگار" میں پہلی بار ایک مضمون شائع ہوا تھا جو نیاز صاحب نے مصری شاعرہ آنسہ می کی عربی شاعری کے بارے میں لکھا تھا اور اسے "نظم منثور کا نام دیا تھا۔

اس دور کے دوسرے ادبی رسائل میں بھی متنوع موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے مگر نگار میں ایک متحرک فکر کار فرما نظر آتی تھی۔ خود نیاز صاحب ہر موضوع پر لکھتے تھے۔ وہ نقاد بھی تھے اور شاعر بھی' افسانہ نگار بھی تھے اور ڈرامہ نگار بھی صحافی بھی تھے اور محقق بھی' ترجمہ نگار بھی تھے اور طبع زاد تخلیق کار بھی' نگار کے مختلف نمبر' ان کی غیر معمولی ہمہ جہت شخصیت ان کے تبحر علمی اور ان کی وسیع

النظر سے گزاو تیں ادبی شخصیتوں اور ادبی موضوعات کے علاوہ سیاسی، تاریخی اور علمی موضوعات پر نگار کے نمبر ہمیں احساس دلاتے ہیں کہ ایک "ادیب" کو اور کیا کچھ ہونا چاہیے۔ ادیب کی شخصیت "ہزار آئینہ" ہوتی ہے۔

مجھے نیاز صاحب سے ملاقات کا شرف بہت کم حاصل ہوا ہے۔ چوں کہ ان سے عقیدت پرستش کی حد تک تھی اس لیے ڈاکٹر عالیہ امام کے ساتھ دو ایک ملاقاتوں سے گفتگو کی سعادت حاصل ہوئی۔ عالیہ نے تعرفاً جب میری "سہ مصرعی صنف سخن" "تثلیث" کا ان سے ذکر کیا تو اس لفظ پر چونکے اور سنانے کی فرمائش کی، ان سے داد پاکر میری خود اعتمادی کو جو تقویت حاصل ہوئی اس کا اندازہ اہل کمال کرسکتے ہیں۔ میرے ایک خط کے جواب میں انھوں نے "تثلیث" کو "ثلاثی" سے بدلنے کا مشورہ بھی دیا نیاز صاحب کا وہ خط مختلف رسائل میں شائع ہوچکا ہے۔ ارباب علم کی نظر سے گزرا ہوگا۔

علالت کے دوران بھی ایک بار میں عالیہ کے ساتھ ملنے گیا تھا بڑی شفقت فرمائی اوار لکھتے رہنے کی تاکید کی۔ عالیہ نے ان کے بازو پر امام ضامن باندھا تو مسکرا کر کہنے لگے۔

"حیف اس چارگرہ کپڑے کی قسمت غالب"

عالیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں نیاز صاحب کی آنکھوں میں زندگی کی چمک دیکھتا رہا۔

نیاز صاحب چلے گئے مگر وہ چمک آج بھی باقی ہے اور ہمیں "حیات بعد الممات" کا مفہوم سمجھاتی رہتی ہے۔

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما" (۱)

نمبرا۔ یہ مضمون بسلسلہ علامہ نیاز فتح پوری یادگاری سالانہ خطبہ منعقدہ ۲۲ دسمبر ۲۰۰۰ء کراچی پڑھا گیا)

ڈاکٹر محمد رضا کاظمی

انتقادیات نیاز

علامہ نیاز فتح پوری یادگاری سالانہ خطبہ ۲۲ دسمبر ۲۰۰۰ء

نیاز فتح پوری اردو تنقید کے دور عروج میں اردو تنقید کی آبرو تھے۔ جتنا اثر اور جتنا نفاذ' ان کی رائے کا ہوا کسی اور کی رائے کا نہ ہوا۔ یہ حیثیت نیاز نے معاصرین کو الگ رکھ کر حاصل نہیں کی' انھیں ساتھ لے کر حاصل کی۔ نگار کے خاص نمبر دیکھ جائیے' وہ نظیر نمبر ہو' مصحفی نمبر ہو یا ریاض نمبر' تنقید نگاروں کی کہکشاں بھی نظر آئے گی۔ نیاز کا اثر کہیں تو براہ راست تھا کہ ناقدین نیاز کی رائے کو بہ طور سند نقل کرتے تھے اور کہیں کہیں ان کا اثر پوشیدہ اور قدرے پیچیدہ تھا۔ نیاز نے خالص تغزل کا تصور پیش کیا' میر و مومن کو غالب پر فوقیت دی۔ کیا یہی رویہ ہمیں محمد حسن عسکری اور سلیم احمد کے یہاں نہیں ملتا؟ نیاز نے مومن کو غالب سے برتر کیوں جانا؟ اس لیے کہ وہ اردو غزل کے روایتی ہنر کے نقاد تھے اور اردو شاعری کی اس روایتی اساس کی وضاحت' غالب جیسے روایت شکن کے ذریعہ ممکن نہ تھی۔

نیاز کا تعلق تنقید کے تاریخی دبستان سے تھا۔ تاریخی تنقید اصطلاحاً اسے کہتے ہیں جس سے زیر نظر شاعر کے عہد کے مذاق و معیار کو بازیاب کیا جاسکے۔ عہد کے پیش نظر' ذوق کا کلام کلیدی ہے۔ سلاست' روانی' محاورہ بندی وہ خوبیاں ہیں جن کو تغزل کا حد کمال قرار دیا گیا تھا اور یہی خوبیاں ذوق کے کلام میں مجسم ہوگئی تھیں۔ جب ہی محمد حسین آزاد نے اردو شاعری کی صف بندی ہی ذوق کے گرد کردی۔ مذاق عام کی نمایندگی غالب نہیں کرتے تھے۔ یہ طرفین کے بیان سے ظاہر ہے شیفتہ اور ظفر نمائندگی کرتے تھے اور انتقادیات میں ان پر مضامین بھی ہیں۔ مگر یہ بھی ایک کنارے

کے شاعروں میں ذوق سے غالب تک جو تبدیلی آ رہی تھی اس کی درمیانی منزل تھی مومن کی شاعری۔ اس گریز کے اسلوب کو گرفت میں لینے کا عمل نیاز کا کارنامہ ہے۔ یہ درست ہے کہ اس ضمن میں وہ غالب کے ساتھ زیادتی کر گئے، لیکن غالب کے باب میں کوئی بات بغیر مبالغے کے قابل غور ہوتی؟ اگر نیاز محض ادبی شخصیت ہوتے تو مومن کی شاعری خواب عدم ان کے ساتھ ہوتی۔ لیکن من و یزداں اور تاریخ دو تین پر نظر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ نیاز نظریاتی اساس سے بیگانہ تنقید نہیں کرتے تھے۔ وہ ہماری ذہنی تاریخ کو جس مرحلہ پر لے آئے تھے وہاں فکری دھارا اوپر جا رہا تھا اور شعری دھارا نیچے آ رہا تھا اور غالب دونوں دھاروں کے بیچ درمیان واقع ہوئے تھے۔ نیاز نے ذاتی پسند کے تحت غالب سے رجوع نہیں کیا۔ عصری معنویت کے دباؤ کے تحت وہ غالب تک آئے۔ غالب کے باب میں نیاز سے زیادتی ہوئی لیکن اس زیادتی کو بھی اس کے تناظر میں دیکھیں۔ نیاز کے الفاظ تھے۔

غالب کا اردو کلام بہت تھوڑا ہے اور اس میں بھی صحیح رنگ تغزل چوتھائی حصے سے زیادہ نہیں" (ص ۱۱۶)

کیا یاس یگانہ نے غالب کے بارے میں کسی دوسری رائے کا اظہار کیا ہے؟ پھر نیاز پر غالب شکن ہونے کا الزام کیوں نہ عائد ہوا؟ صرف اس لیے کہ یاس یگانہ نے غالب کا آتش سے موازنہ کیا تھا اور نیاز نے مومن سے جن کا کلام موازنے کی کہیں زیادہ محکم بنیاد ثابت ہوا۔ موازنے سے قطع نظر، نیاز نے کلام مومن کی جو تحلیل و تحدید کی ہے وہ اردو تنقید کو ان کی بیش قیمت عطا ہے۔ نیاز فتح پوری پہلے مومن کے چند اشعار نقل کرتے ہیں جن میں آخری دو یہ ہیں

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

بقدر جوش تڑپنے کو تھا ولے پس قتل
وہ بے قرار ہوئے آ گیا قرار مجھے

پہلے شعر میں جو حقیقت پسندی ہے، وہ غالب کو چھوتی ہوئی فراق تک آ گئی ہے

دوسرا شعر غزرتا ہوا جگر کا ہم نشین ہوا' اب مومن کے ان اشعار پر نیاز کی رائے ملاحظہ ہو۔

"مومن نے ان اشعار میں جن جذبات کا اظہار کیا ہے' وہ ان سے بہت مختلف ہیں جوان کے دوسرے اشعار میں پائے جاتے ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ مومن کا اصلی رنگ یہ نہیں ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اگر ان کی محبت ذرا بلند ہوجاتی تو پھر آج یہ جستجو نہ ہوتی کہ اردو شاعری میں دوسرا میر کون ہوسکتا ہے" (ص ۱۴۳)

ذرا سی توجہ اس بات پر کہ نیاز براہ راست جذبہ پر تبصرہ کررہے ہیں۔ وہ مومن کے انفعالی جذبات کو میر کے انفعالی جذبات سے نسبت نہیں دے رہے ہیں' بلکہ اس رنگ کو نسبت دے رہے ہیں جو دو طرفہ تناؤ سے آب دار ہورہا تھا۔ وہ مومن کے اس ضمنی اسلوب پر ان کی منزلت طے کررہے ہیں' اور وہ اس اسلوب کو اس لیے درنظر رکھ رہے ہیں کہ میر سے مومن کا کلام نوعیت میں نہ سہی درجے میں نسبت پاجائے۔ غرض مومن کی تعین قدر اور مومن کی تعین طرز دونوں میں نیاز نے بصیرت افروزی کی مثال قائم کی ہے۔ مومن کی عطا وہ ہے جس کے مضمرات کو جانے بنا ہم اپنے شعری ورثہ کے مزاج شناس ہی نہیں ہوسکتے۔

اب نیاز کی غالب شناسی کو بھی اسی وسعت میں دیکھیے۔ نیاز فتحپوری کا آخری دور کم و بیش غالب کے لیے وقف تھا۔ نگار ۱۹۶۱ء کا سالنامہ غالب نمبر تھا جسے مکمل طور پر خود نیاز نے تحریر کیا تھا۔ اس کے علاوہ مشکلات غالب کا سلسلہ جو بعد میں کتابی شکل میں آیا۔ نیاز اپنے قیمتی لمحے میر کے بھی حوالے کرسکتے تھے' جو جیسا کہ قاضی افضال حسین اور شمس الرحمان فاروقی کی مساعی سے ظاہر ہے زیادہ کھلا ہوا میدان تھا۔ میر اور معاصرین میر کے بارے میں نیاز کے مجمل اشارے بتارہے ہیں کہ اگر محض شعری تنقید انھیں مطلوب ہوتی تو وہ اسی عہد کی ہمیں سیر کراتے۔ سودا کے بارے میں ان کی رائے ملاحظہ فرمایئے۔

"سوز و گداز ان کے یہاں بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے'
لیکن سادگی و سلاست اور اسلوب بیان سے کام لے کر انھوں
نے یہ کیفیت بھی پیدا کردی۔ (ص ۱۰۳)

میر کے بارے میں نیاز کا کہنا تھا کہ درد اور سوز کے برعکس ان کے یہاں ایہام کا عیب تھا اور کچھ غیر فنی عیوب کا تذکرہ کرتے ہیں:

باایں ہمہ معیار تغزل کے لحاظ سے کسی عہد میں اس کا نظیر نہیں
پیدا ہوا اور سوز و گداز' عجز و فتادگی' والہانہ ربودگی' معاملات
محبت کی چھان بین' تجزیہ کیفیات' سلاست و روانی' آمد و بے
ساختہ پن کے لحاظ سے ارتقائے غزل گوئی کی جس منزل پر وہ پہنچا
کسی دوسرے کو نصیب ہی نہیں ہوئی۔ یقیناً درد کے کلام میں
بھی تقریباً یہی باتیں پائی جاتی ہیں لیکن بہ اعتبار کمیت و کیفیت میر
کو نہیں پہنچے۔ سوز تو خیر نہایت ہی سیدھے سادھے عاشق تھے
اور سوائے اس کے کہ صاف صاف الفاظ میں اپنے دل کا حال
بیان کردیں اینچ پینچ کی باتیں جانتے ہی نہ تھے۔ (ص ۱۰۳)

یہاں محاسن سودا اور معائب میر کا جو تقابل ہے' کاش ہمارے ماہرین سودا کے حصے میں بھی آتا' بس ایک جھلک فیض احمد فیض کی زبانی رائے میں ملتی ہے۔ درد کے بارے میں مجملاً اس سے زیادہ منصفانہ بات کہی نہ جاسکتی تھی اور رہے سوز' تو ذرا خیال کیجئے کہ اسی ایک جملے اور اسی ایک وصف پر میر سوز کے بارے میں نیاز کا پورا مضمون استوار ہے۔ کاش یہاں نیاز کی اجمالی اور تفصیلی تنقید کا ربط ظاہر کرنے کی گنجائش ہوتی بہر حال نواب آصف الدولہ اور نظام شاہ رامپوری پر ان کے مضامین بھی اسی نوعیت کے ہیں' یعنی فطری صلاحیت رکھنے والے خوش گو شاعر جن کا طرز منفرد نہ تھا لیکن جو اردو کے مجموعی مزاج سخن کی تعمیر میں حصہ دار ہوں' ان کو ان کا حق دلانا نیاز کی تنقید کا بہت مثبت پہلو ہے۔ یہاں تک کہ شیفتہ کو مومن و غالب کا ہم جلیس و ہم مزاج شاعر کہہ کر بھی ان کی انفرادیت ظاہر کرنے سے پہلو بچا جاتے ہیں۔

یہ شیفتہ کا بہ حیثیت شاعر عیب رہا ہو بہ حیثیت ناقد ایک وصف ہے۔

نظیر اکبر آبادی اور بہادر شاہ ظفر پر نیاز کے مضامین عام تنقیدی مفروضوں کی اصلاح اور گمنام ادبی اوصاف کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ ظفر کو بالقوہ نشاطیہ شاعر اور بالفعل الیہ شاعر قرار دینے میں وہ حق بہ جانب ہیں۔ نظیر پر ان کا مضمون زیادہ تر غیر مطبوعہ کلام کی بنیاد پر تھا اس میں غزل گو کی حیثیت سے نظیر کی انفرادیت کو ظاہر کرنے کے باوجود آخر میں یہی لکھتے ہیں کہ

> "اردو شاعری میں تغزل سے ہٹ کر سب سے پہلے اسی نے نظمیں لکھنے کی ابتدا کی اور سچ پوچھیے تو انتہا بھی کر دی۔ لیکن افسوس وہ بہت قبل از وقت پیدا ہوا۔ وہ اس زمانے کا شاعر تھا اور اسی زمانے میں سے ہونا چاہیے تھا۔ (ص ۱۹۰)

ان کے زمانے میں اسی اکبر آباد نے جو شاعر پیدا کیا وہ سیماب تھے۔ کار امروز پر تبصرہ کرتے ہوئے نیاز نے کئی پر لطف نظموں کی نشاندہی کی ہے۔ رنگین تیتری، قشقہ، سری کرشن جس کے حوالے سے نیاز نے لکھا کہ

> سیماب صاحب قدرتاً تغزل کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور جب موقع اس نوع کی گفتگو کا آجاتا ہے تو وہ بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔ (۲۳۱)

سیماب کی جس آخری نظم کا حوالہ نیاز نے دیا ہے وہ ہے "تاج بہ کنار شفق" اس کا ایک شعر ہے:

گلوں کے قمقمے جلے کنول جھکا ہوا اٹھا
شفق ہوئی جو رنگ بار تاج جگمگا اٹھا

نیاز نے جس نظم کا حوالہ دیا، وہ سب میں سبک اور رواں ہے ورنہ ان کی اچھی اچھی نظموں کا مقابلہ اختر شیرانی کی نظموں سے کر لیجیے بوجھل نظر آئیں گی۔ برخلاف اس کے سیماب کی غزلوں کو دھیان میں لائیے، ان میں بجلی بھری ہوئی ہے۔

خود قصہ غم اپنا کوتاہ کیا میں نے

دنیا نے بہت جا افسانہ بنا دیتا

غزل کی ماہیت کا سرا، نظم کی خاصیت سے کیوں کہ ملایا جاتا ہے، اس کے داخلی اور فنی تقاضے کیا ہیں؟ اس کا جواب اس وقت ملے گا جب نظیر اکبر آبادی اور سیماب اکبر آبادی پر نیاز کے مضامین کو تسلسل میں ہم پڑھیں۔ اب چوں کہ مقطع قریب آرہا ہے سیماب پر نیاز کی اس رائے کو دیکھتے چلئے

"الغرض یہ اور اس قسم کے بہت سی غلطیاں جو اس مجموعہ (کارامروز) میں نظر آتی ہیں ایک ایسے شخص کے کلام میں ان کا پایا جانا جو اپنے آپ کو ہندوستان کا شاعر اعظم کہلانا پسند کرتا ہے، یقیناً حیرت ناک ہے تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ سیماب صاحب فطرتاً شاعر ہیں اور اس دور کے اچھا کہنے والوں میں ہیں۔" (۲۵٦)

نیاز اور سیماب کے مشترک حریف ہیں جوش، لیکن پہلے ایک نظر ان کے معاصر فراق پر، کہ فراق نیاز کی سب سے بڑی دریافت ہیں انھوں نے فراق کے شاندار مستقبل کی پیشین گوئی کی تھی۔ یہ پیشین گوئی کیسے پوری ہوئی وہ محتاج بیاں نہیں تاہم یہ بتانا ضروری ہے کہ فراق کے خلاف جو رد عمل ہوا، اس کی بنیاد بھی نیاز فتح پوری کے مضمون میں ہے کہ نیاز یک طرفہ تنقید نہیں لکھتے تھے:

"اگر ہم اس وقت معلوم کرنا چاہیں کہ فراق کا اصل رنگ کیا ہے تو ہم کسی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے ... جس وقت ہم فراق کی طرحی اور غیر طرحی غزلوں کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہم کو دونوں میں بین فرق محسوس ہوتا ہے (ص ۳۰۰ ـ ۳۰۱)

غرض نیاز کی مدح و قدح دونوں ہی کو محکم جانیے۔ اب آجائیے جوش پر جن کے یہاں فراق کو قدرت سخن کی زیادتی نظر آتی تھی اور نیاز کو کمی۔ اس معرکہ کا حوالہ میں نقوش جوش میں دے چکا ہوں اور میرا مجموعی جھکاؤ جوش کی جانب ہے تاہم انصاف کا تقاضا ہے کہ کہہ دیں کہ ماسوا جوش کی نظم نقاد کے جوش بیاں طرز تنقید

بالکل وہی تھا جو نیاز کا تھا۔ نظم تو نظم جلیل الرحمان اعظمی کی کتاب "حیات متنبی" پر جوش کا تبصرہ دیکھ جائیے آپ حرف بہ حرف میری تائید فرمائیں گے۔ پھر جوش کے اس اعتراف کو یاد کیجئے جس کے راوی سوز شاہجہاں پوری ہیں۔ ایک بحث کو رد کرتے ہوئے جوش ملیح آبادی نے فرمایا:

"گرفت کس نے کی ہے؟ اور پھر خود ہی جواب دیا نگار نے۔
لہٰذا بحث کی گنجائش نہیں تم سب کیوں میری شام خراب کر رہے ہو؟"

اب جوش ہی کے جلو میں جگر ہیں۔ نگار کے جگر نمبر کو بالعموم نیاز کی ایک لغزش سمجھا گیا ہے لیکن اس کے تمام پہلوؤں پر غور نہیں کیا گیا اور اس منفی ردعمل کا سبب صرف یہی ہے کہ کس تعزیتی اظہار میں تنقیص کی جگہ نہیں ہوتی۔ لیکن جگر نمبر نیاز کے تعزیتی جذبات کا اظہار نہیں۔ تعزیتی جذبات کا اظہار نیاز نے نگار کے اکتوبر ۱۹۶۰ء کے اداریے میں کیا تھا۔ یہ اداریہ بھلا دیا گیا ہے اس لیے اس کے چند جملے میں یہاں آپ کو سناتا ہوں:

جگر بڑے اچھے شاعر تھے' لیکن اس سے زیادہ اچھے انسان۔ شاعر ہونے کی حیثیت سے تو کہیں کہیں ان پر نکتہ چینی ہو سکتی ہے لیکن انساں ہونے کی حیثیت سے ان کے خلاف بہت کم کہا جاسکتا ہے۔ اپنے اخلاق سے وہ فرشتہ صفت انسان تھے اور آخر کار فرشتوں میں جاکر مل گئے ... شاعر ہونے کی حیثیت سے میں ان کی بڑی عزت کرتا تھا' کیوں کہ حسرت' فانی اور اصغر کے بعد غزل گو شعراء میں تنہا انھیں پر نگاہ پڑتی تھی اور اس میں کلام نہیں کہ ان کے شعر اکثر معیاری ہوتے تھے۔ ان کے یہاں ایک خاص والہانہ کیفیت پائی جاتی تھی۔ ان کا ایک مخصوص لب ولہجہ تھا اور ان میں سے کوئی بات مستعار نہ تھی۔ ان کا آخری مجموعہ آتش گل کے نام سے شائع ہوا ہے جو غالباً ان کے تمام

کلام پر مشتمل ہے۔"

اس آخری جملے کو ذرا محفوظ رکھیے گا، مگر پہلے یہ دیکھیے کہ ایک ذمہ دار ادبی مدیر کی حیثیت سے انھوں نے عام ردعمل کی ترجمانی کی۔ اگلے ماہ یعنی نومبر ۱۹۶۰ء کے نگار میں نیاز نے قیسی الفاروقی کا مضمون جگر اور کلام جگر شائع کیا۔ اب آیا توصیف کے افراط کی وجہ سے یا ممکن ہے کہ کسی خارجی سبب کی بنا پر نیاز نے جولائی ۱۹۶۱ء میں نگار کا جگر نمبر شائع کیا۔ اس کے کلیدی الفاظ حسب ذیل ہیں:

> سرور نے آتش گل کا دیباچہ اس جملے سے شروع کیا ہے کہ "جگر ایک رومانی شاعر ہیں۔ اس سے بہتر جگر کی شاعری پر تبصرہ ممکن نہیں ... جگر یقیناً رومانی شاعر ہیں اور ان کا لب و لہجہ بھی رومانی ہے لیکن اسلوب بیان صرف لب و لہجہ کا نام نہیں اس کا تعلق اور بہت سی باتوں سے بھی ہے (جن کا ذکر میں ابھی کرچکا ہوں) اور اگر ان کو سامنے رکھا جائے تو جگر کو قدر اول کا شاعر بہ مشکل تسلیم جاسکتا ہے۔ وہ سوچنے کی حد تک تو یقیناً بڑے کامیاب شاعر ہیں لیکن جتنا اچھا وہ سوچتے ہیں۔ اتنا اچھا کہہ نہیں سکتے۔ یعنی احساس و فکر کے لحاظ سے وہ یقیناً کامیاب ہیں لیکن قوت اظہار کے لحاظ سے کوئی استادانہ حیثیت نہیں رکھتے۔

(۳)

یہاں اختلاف کی گنجائش تو ہے احتجاج کی گنجائش نہیں۔

حاضرین کرام۔ ایک تہائی صدی قبل میں پہلے تحریری طور پر نگار میں، پھر ذاتی طور پر علامہ نیاز فتح پوری کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ آج بزم نگار سے رخصت ہوتے ہوئے مجھے اپنی جسارت کا احساس ہورہا ہے۔ افسوس کہ اس احساس کو میں جدید نسل تک نہیں پہنچا سکتا۔ نیاز فتح پوری کی بصیرت سے یہ منظر بعید نہیں۔ اس نجی سجائی بزم کو دریچہ جنت سے دیکھ کر وہ یہی شعر پڑھ رہے ہوں گے۔

نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

متن نیاز فتح پوری' انتقادیات کراچی' ۱۹۵۹ء

۱۔ سوز شاہ جہاں پوری' نیاز صاحب میری نظر میں مشمولہ فرمان فتح پوری (م) نگار پاکستان کراچی نیاز نمبر سالنامہ ۱۹۶۳ء جلد دوم ص

۲۔ نیاز فتح پوری (م) ملاحظات نگار لکھنؤ اکتوبر ۱۹۶۰ء ص ۵

۳۔ نیاز فتح پوری (م) نگار جگر نمبر لکھنؤ جولائی ۱۹۶۱ء ص ۵

کے۔ اے۔ فاروقی

نیازؔ کے قلم کا جادُو

میں اسے اپنی انتہائی بدنصیبی سمجھتا ہوں کہ میں ایک مدّت تک حضرت نیازؔ اور اُن کی تخلیقات سے دانستہ بے نیاز رہا —— دانستہ اس لئے کہ جس کسی سے بھی سُنا یہی سنا کہ وہ مذہبی معاملات میں عام خیالات سے ہٹ کر چلنے کے عادی ہیں۔

"شُنیدہ" کو حرف بہ حرف "مانندِ دیدہ" سمجھ لینے والوں نے صحیح رائے قائم کرنے میں ہمیشہ ٹھوکر کھائی ہے۔ مدّتوں میں بھی اِسی ٹھوکر کا شکار رہا ہوں۔ یہ ٹھوکر نہ کھائی ہوتی تو میں نیاز صاحب سے اُن کی زندگی ہی میں، وہ جہاں کہیں بھی ہوتے، شرفِ نیاز حاصل کرتا —— افسوس کہ میں خوابِ غفلت سے اُس وقت بیدار ہُوا جبکہ وہ دُنیا سے موڑ کر ابدی نیند سو چکے تھے —— یہ بیداری میرے حصہ میں کیسے آئی؟ اس سلسلہ میں میں اپنے ایک عزیز دوست کا رہینِ احسان ہوں جو ایک عمر سے علامہ موصوف کی تحریروں سے متاثر چلے آتے ہیں۔ ایک دن ایک ملاقات میں مجھ سے یہ اخذ کر کے کہ میں نے اُن کی کوئی تحریر نہیں پڑھی سخت مایوس اور حیران ہوئے اور اسی حیرانی کے عالم میں اُن کی زبان سے بے اختیار نکلا کہ جس نے نیازؔ فتحپوری کے اُدب پاروں کو نہیں دیکھا، بہت کچھ دیکھنے کے باوجود، اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ اُن کے دل سے نکلی ہوئی یہ بات دل میں اُتر گئی۔ اپنی غفلت پر ندامت ہوئی مگر شکر ہے ندامت اب یُوں رنگ لائی ہے کہ ان کی کتابوں کے علاوہ کوئی دوسری کتاب آنکھوں میں جچتی ہی نہیں۔

سب کتابوں سے بڑھ کر جس کتاب نے مجھے متاثر کیا وہ "مکتوباتِ نیازؔ" ہیں اور اِسی لئے یہاں اقتباسات کے انتخاب کے لئے مکتوبات ہی زیرِ نظر رہے ہیں گر بدقسمتی سے لائبریریوں کے علاوہ اب یہ کہیں اور دستیاب ہی نہیں۔ تینوں جلدوں کو صرف ایک بار پڑھ لینے سے سیری نہیں ہوتی بلکہ جوں جوں ان سے اپنی پیاس

بجھاتے ہیں، توں توں پیاس بڑھتی ہی جاتی ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مکتوبات پڑھ لینے کے بعد ہم محظوظ ہی نہیں ہوئے بلکہ مسحور بھی ہوئے اور یہ وہ جادو تھا جو سر چڑھ کے بولا ہے۔ نیاز مرحوم کے ادبی شہ پاروں سے ایک عرصہ تک بے نیازی اور محرومی پر دوست عزیز کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو حرف بہ حرف صحیح پایا۔

نیاز صاحب اپنی راہ خود بناتے تھے۔ بنے بنائے راستے پر چلنا انھیں کسی طور گوارا نہ ہوا اسی طرح وہ اپنے طرزِ بیان میں بھی سب سے الگ تھے ——— اُن کی یہی تنہائی ہمیں بھا گئی۔ اُن کی تحریروں میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہے کہ جس لفظ نے جو جگہ پائی وہ گویا وہیں کے لئے وجود میں آیا تھا اور جو شعر جس موقع اور محل پر چسپاں ہو گیا وہ یوں محسوس ہوا جیسے شاعر نے اسی موقع اور محل کے لئے تخلیق کیا تھا ——— دمِ عیسےٰ سے مُردے جی اُٹھتے تھے، دمِ نیاز سے بے جان الفاظ زندگی پاتے ہیں ——— مسیحائی وہ بھی تھی، مسیحائی یہ بھی ہے۔ اسی ضمن میں چند اقتباسات دیکھئے، اپنی قدرت کا ملہ سے کیا موتی پروئے ہیں :-

(۱) ارے بھائی اُن کی کیا ہے " وہ جسے چاہتے ہیں اپنا بنا لیتے ہیں " مشکل تو ہماری تمہاری ہے کہ " ڈوبنے جائیے تو دریا ملے پایاب ہمیں "

(۲) یہ سب کچھ میری سیاہ بختی سہی لیکن ہے میری اپنی، اور اسی لئے مجھے اس نورِ باطن سے زیادہ عزیز ہے جو کسی اور سے مستعار لیا گیا ہو۔

(۳) میں نے تو اندوہِ وفا سے چھوٹنے کی بہت کوشش کی لیکن " وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا "

(۴) آپ کی رنجشیں تو بارہا دیکھیں " پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے "

(۵) اسے بے خبر! خلیل کے لئے آگ مہیا کی گئی اور وہ نہ جلے ——— یہاں آگ کا پتہ نہیں اور جل رہے ہیں۔

(۶) بحیثیت انسان ہونے کے ان کا مطالعہ کیجئے، مسلمان ہونے کی حیثیت سے

نہیں ۔ مینار اگر زیادہ بلند ہے تو نگاہ کو بھی اتنا ہی بلند کرنا پڑے گا اگر آپ اُسے دیکھنا چاہتے ہیں۔

(۷) ارادہ ہے بمبئی چلا جاؤں اور وہاں بھی چند دن "سر جوڑ کے تقدیر کو رو آؤں"

(۸) میں کب تک دُنیا سے چھپ کر آنسو بہاتا رہوں گا ۔ آہ!" اک دُھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے۔"

اجمال بلیغ ہو تو وہ کام کر جاتا ہے جو تفصیل سے کبھی نہ ہوا ہو۔ علامہ مرحوم نے بعض مقامات پر گنتی کے صرف چند لفظوں سے دریا کو کوزے میں بند کیا ہے بلکہ کہیں کہیں تو سکوت ہی کو ذریعہ اظہار بنایا ہے ۔ وہ ایک جگہ خود لکھتے ہیں: " اگر کوئی شخص میری نگاہوں سے یہ نہیں سمجھ سکتا کہ میں کیا چاہتا ہوں تو پھر میں اس کے لئے پتھر کا بُت بن جاتا ہوں"۔

—— دریا کو کوزے میں کیسے بند کیا ہے ! ملاحظہ ہو:-

(۱) صنادید کی عظمت ان کی کہنگی ہی میں ہے ۔ تاج محل کبھی ڈرائینگ روم نہیں بن سکتا ۔

(۲) خدا کی شان ہے کہ فطرت 'یہ' اور قسمت 'وہ' ! (ذرا 'یہ' اور 'وہ' پر زور دیکر پڑھیئے پھر دیکھئے یہ کیا قیامت ڈھاتے ہیں)

(۳) آپ ہی فرمائیے کہ میں کب حاضر ہوں ۔ آپ حسبِ معمول اس کا جواب شاید یہی دیں گے کہ " ابھی نہیں " لیکن میں زیادہ خوش ہوں گا اگر آپ کہہ دیں " کبھی نہیں " کسی طرح یہ " رد و قبول " کا جھگڑا تو ختم ہو!

(۴) مُسکرائیے نہیں زخم کے ٹانکے ٹوٹتے ہیں۔

(۵) تم نہیں جانتے تو نہ جانو! " پتہ پتہ ، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے"

(۶) مہینوں سے آجکل " میں مبتلا ہوں ۔ اب کشتی کنارے آلگی اور صرف چند دن کا مہمان ہوں

(۷) کیوں صاحب! تحائف کی تقسیم خویش سے گزر کر دُرویش تک پہنچی ہی نہیں ۔

(۸) دل ٹوٹنے کے بعد کسی دلیل سے نہیں جڑتا !

اب نیچے دیئے ہوئے جملوں کو پڑھ جائیے۔ سرسری نظر میں تو یہ معمولی اور سادہ سے جملے ہیں مگر دیکھئے کہ یہ نثری شاعری نہیں تو کیا ہے :

۱۔ جب ماحول سے کام نہ چلے تو ماحول کو بدل دینا ضروری ہے۔

۲۔ زندگی سے گزر جانا اتنی بڑی بات نہیں جتنا زندگی گزار دینا

۳۔ دُنیا سے دامن کشاں گزر جانا اتنا مشکل نہیں جتنا کانٹوں میں اُلجھا کر دامن کو صحیح وسلامت لے آنا

۴۔ جوانی میں بوڑھا ہو جانا اتنا مشکل نہیں جتنا بڑھاپے میں جوان ہونا

۵۔ جن آنکھوں کو تم نے سوگوار دیکھا کل وہ ہنس رہی تھیں۔ اب یہ خبر نہیں کہ میرے حال پر یا تمہارے حال پر

(۶) مجھے زبان پر قابو حاصل ہے لیکن غم و غصہ پر نہیں —— کہوں گا نہیں لیکن کڑہوں گا ضرور۔

(۷) منزل تک پہنچ جانا شاید اس قدر دلچسپ نہیں جتنا منزل تک پہنچنے کا خیال

(۸) دنیا میں کسی پر احسان کرنا اتنا دشوار نہیں جتنا اعتراف احسان !

وہ بہترین مصوّر تھے —— اپنے تأثرات کی ایسی تصویر کھینچتے تھے کہ تصویر پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ جے گڑھ کی عورتوں کے بارے میں اپنے تأثرات ایک دوست کو لکھتے ہیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عورتیں جیتی جاگتی ہمارے بالکل سامنے بیٹھی ہیں اور ہم اُنھیں اِن آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں :۔

(۱) "راجپوتوں کی لڑکیاں ہیں بلند و بالا، صحیح و توانا، تیوریاں چڑھی ہوئی، گردنیں تنی ہوئی، آنکھوں میں تیر، مانگوں میں عبیر، ابروؤں میں خنجر، بالوں میں عنبر، ہاتھوں میں مہندی، ماتھے پر بندی، اب آپ سے کیا کہوں کیا چیز ہیں ؛ قامت رعنا کی وہ ادا کہ لچکدار نیزہ بھی شرمائے، کمر میں وہ لوچ کہ بید کو بھی عار آئے"

اب ایک رقص بھی ملاحظہ ہو۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے محفلِ رقص میں ہم بھی شریک ہیں

(۲) "ہر ادائے رقص قیامت تھی لیکن ایک جگہ رقص کرتے کرتے گردن کو موڑ کر نیم وا آنکھوں میں مستی کی خاص کیفیت پیدا کر کے اس نے اپنے ہونٹ کو دانتوں سے دبایا تو ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے دل نکال لیا . . . میں سمجھتا تھا کہ رقص کا تعلق محض حرکات سے ہے لیکن ایک جگہ اس نے بالکل خاموش، بے حس و حرکت رہ کر یہ بھی بتا دیا کہ بعض اوقات سکوت بھی رقص بن جاتا ہے اور یہ اتنا بلیغ و عمیق رقص ہوتا ہے جسے نگاہیں نہیں بلکہ صرف دل دیکھتا ہے، روح دیکھتی ہے"

چند تصویریں اور دیکھیے ۔ یہ ماننا پڑے گا کہ یہ تصویریں وہ نقشہ آنکھوں کے سامنے پیش کرتی ہیں جو شاید اصلی تصویر بھی پیش نہ کر سکے

(۳) "عریانی بری چیز نہیں بشرطیکہ وہ نیم عریانی سے آگے نہ بڑھے ——— بدن چرا کر چلے جانے میں سینہ تان کر سامنے آ جانے سے شاید زیادہ لطف ہے"

(۴) "یہ نہ پوچھیے کہ حسن کیا تھا؟ ——— بس یوں سمجھیے کہ جوانی کانٹے پہ تُل رہی تھی"

(۵) "معیاری حسن تو وہی ہے جو لباس سے جدا ہونے کے بعد اور نمایاں ہو جائے نہ کہ بالکل ختم!"

میرے بس کی بات ہوتی اور خوفِ طوالت نہ ہوتا تو میں مکتوبات کے اقتباسات پہ کبھی اکتفا نہ کرتا ۔ مکتوبات کی تینوں جلدوں کو حرف بہ حرف قلمبند کر دیتا ۔ یوں خوب سے خوب تر کی تلاش کی محنت سے بھی بچ جاتا اور موجودہ اقتباسات میں مکتوبات کے باقی حصوں کی عدم شمولیت کی ناانصافی کا بھی مرتکب نہ ہوتا مشکل تو یہ ہے کہ جو جملے اقتباسات میں شامل نہیں ہو سکے اُن پہ اب نگاہ ڈالتا ہوں تو وہ اُن سے کہیں بہتر دکھائی دیتے ہیں جنہیں یہاں بطور مثال اور نمونے کے پیش کیا گیا ہے ۔ سچی بات تو یہ ہے کہ حضرت نیازؔ کی کسی ادا کو نظر انداز کرنے کو جی نہیں چاہتا ۔ طوالت کی ناگواری تو اتنی پریشان کُن نہیں کہ یہ تو "معذرت" کے ایک لفظ سے دُور ہو جائے گی مگر اِن "نوادرو" جملوں کو جو دماغ سے نکل کر نوکِ قلم تک آ پہنچے ہیں، سپردِ قلم نہ کیا گیا تو یہ تلخی کبھی کم نہ ہو گی ۔

انہیں بھی اب دیکھ لیجیے ——— "ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ!"

(۱) "عتاب نامہ ملا۔ لیکن مجبوری دیکھئے کہ اسے عتاب کہنے کی بھی تاب مجھ میں نہیں۔"

(۲) "عدم علم کا علم بھی بڑی بات ہے۔"

(۳) "میں جواب کا منتظر ہوں اور اس قدر بے چینی کے ساتھ کہ ممکن ہے انتظار بھی نہ کر سکوں۔"

(۴) "زندگی بڑی مشکل چیز ہے۔ یہاں تو شراب کی جگہ شراب ہی چاہیئے۔ یہ نہیں کہ پانی نہ ملا تو تیمم کر لیا۔"

(۵) "آپ پوچھتے ہیں کہ کشمیر سے آپ کے لئے کیا لایا؟ یہ پوچھتے کہ پاس کیا تھا جو بچا لایا۔"

(۶) "معاف کیجیئے تعلقِ خاص رکھتا ہوں اس لئے کہہ رہا ہوں ورنہ مجھے کیا غرض ہے کہ ہر وہ شخص جو پہاڑ سے ٹکرائے اسے سمجھاتا پھروں۔"

(۷) "موسم خوشگوار ضرور ہے لیکن شاید ضرورت سے زیادہ۔ اب تو ہر چیز بنی تلی چاہیئے۔ کانٹا ذرا بھی کسی طرف جھکا اور خلش پیدا ہوئی۔"

(۸) "عمر کی ناپ ماہ و سال سے نہیں کی جاتی بلکہ اُن چند ساعتوں سے" جو کسی کی یاد میں گذر جائیں۔"

(۹) "زندگی ہو یا موت زمین سے ہمارا تعلق چند گز سے زیادہ نہیں۔ اس سے آگے پاؤں پھیلانا دوسرے کا "حق ہمسائیگی" غصب کرنا ہے۔"

(۱۰) "اگر آپ کے پاؤں میں کانٹے نہیں چبھے تو تھوڑی دیر ٹھہر کر انھیں کو دیکھئے جو راہ میں بیٹھ کر تلوؤں سے کانٹے نکال رہے ہیں۔ ہمدردی نہ سہی تماشہ ہی سہی۔"

یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ علامہ موصوف کے رشحاتِ قلم کو گھنٹوں لکھتے جائیے، پڑھتے جائیے، نہ انگلیاں تھکتی ہیں اور نہ دماغ بوجھ محسوس کرتا ہے بلکہ ہمارا حال تو یہ ہے کہ جب کبھی دن بھر کی تھکن وجۂ اضمحلال ہوئی، ہم نے مکتوباتِ نیازی کے مطالعہ سے وہ راحت و سکون پایا جو سامانِ عیش و طرب سے بھی میسّر نہ آیا۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خان

اردو فکشن کی ترقی میں نیاز فتح پوری کا حصہ

نیاز فتح پوری کے لیے اگر یہاں سے بات شروع کی جائے کہ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے کے ابتدائی دو تین سال سے لے کر آج تک وہ ہمارے ادب پر اپنے اثرات کا احساس دلاتے رہے ہیں نامناسب نہ ہوگا۔ نیاز کے مجموعی ادبی اور علمی اثاثہ پر نظر کریں تو یہ تاثر واگزار ہوتا ہے کہ یہ کئی اداروں یا اکادمیوں کی مساعی کا نتیجہ ہے لیکن یہ ایک ایسی شخصیت کے کارنامے ہیں جو وسیع النظر، عالی دماغ، کثیر المطالعہ، جامع العلوم، صاحب فہم وفراست تھا اور جس کی ژرف نگاہی مسلم الثبوت تھی۔ اپنے مفکرانہ خیالات کی عکاسی کے لیے انھوں نے وسیع وعریض میدان کا انتخاب کیا تھا۔ اس میدان میں انھوں نے ذہنی زبوں حالی، تعصبات، فکروسوچ کے دیوالیہ پن، کٹ حجتی کے حامل کھلاڑیوں سے مرعوب ہوئے بغیر مقابلہ کیا۔ وہ تمام عمر مناقشوں کے درمیان بڑی شان سے زندہ رہے۔ مخالفین کو دلائل کے ساتھ چیلنج کرتے رہے تاکہ جواب آئے۔ وہ خردافروزی کے قائل تھے اور چاہتے تھے کہ اہل فکرودانش کوتاہ بینی اور تنگ نظری سے اجتناب برتتے ہوئے فکری مسائل کے حوالے سے جو کہ ذہنی انتشار کا باعث بنتے رہے ہیں اپنی ایسی آراء پیش کریں جن سے معاشرہ نہ صرف استفادہ کرسکے بلکہ جدید دور کے تقاضوں کے مطابق نئی سمتیں بھی تلاش کرسکے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے خیالات سے اختلاف کی گنجائش موجود نہ تھی، ادیبوں نے ان سے اختلاف بھی کیا جسے وہ خوش دلی سے برداشت کرتے رہے اس لیے کہ وہ خردافروزی اور مکالمے کے آدمی تھے۔ ان کے فکشن سے اختلاف کیا گیا لیکن ان کے دو مختصر ناول ''ایک شاعر کا انجام'' اور ''شہاب کی سرگزشت'' اور رومانی افسانے آج بھی اردو ادب کی تاریخ میں ایک خاص دور کے رجحاناتی فکشن کے حوالے سے تادیر زیر بحث رہیں گے۔

اس سے قبل کہ ہم ان کے مذکورہ فکشن پر بحث کریں یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ ان کا عہد کیا تھا، اس کے تقاضے کیا تھے اور یہ کہ ان کے عہد کا سماجی، ادبی، معاشرتی اور سیاسی پس منظر کیا تھا۔ نیاز کے سامنے فکشن کے حوالے سے ڈپٹی نذیر احمد، سرشار، شرر، مرزا ہادی رسوا، راشد الخیری وغیرہ کی خاص مثالیں تھیں۔ ڈپٹی نذیر احمد اصلاحی قلب وذہن لے کر پیدا ہوئے تھے، لہٰذا ''مراۃ العروس'' سے لے کر ''ایامیٰ'' تک وہ مردوزن کو اخلاقیات ومذہبیات کے سانچوں میں ڈھالنا چاہتے تھے تاکہ معاشرہ میں سماجی برائیاں کم سے کم ہوں۔ سرشار کا ''فسانہ آزاد'' گوکہ تفریح کے لوازمات کا حامل تھا اور خوجی اور آزاد آئیڈیلزم کے مصنوعی مظاہر کا نمونہ تھے، لیکن اس میں بھی حقیقت پنہاں تھی۔ شرر نے معاشرتی ناول لکھے لیکن تاریخ ان کا محبوب تھیم Theme بنا۔ معاشرتی ناولوں میں اُنھوں نے جہالت، فرسودہ روایات، توہم پرستی، احمقانہ رسم ورواج پر وار کیا اور اصلاح کی صورتیں بجھائیں اور تاریخ کے ذریعے بھی معاشرتی اصلاح کا کام لیا۔

راشد الخیری کے ہر دکار اصلاحی تھے۔ ان کے افسانوں یا یوں کہیے کہ ناولوں کا مقصد عورتوں پر خانگی سطح پر روا رکھے جانے والے مظالم اور ظالمانہ رسوم ورواج کا سدِباب تھا، اس لحاظ سے مولانا ۱۸۵۷ء کے بعد کے جدید ادوار کے لیے آزادیِ نسواں کے مبلغ یا علم بردار ٹھہرائے جانے کے مستحق ہیں۔ مرزا ہادی محمد رسوا ذہین فن کار تھے۔ ان کے ناولوں میں ''اُمراؤ جان ادا'' کا خاص مقام ہے۔ اُنھوں نے لکھنؤ کے دور کو زندہ کیا، سماج کی وہ نفسیات زیرِ بحث لائے جس میں عورت کا خاص کردار ہے اور نوابی عہد کے خاتمے کی رمزیہ اشارے دیئے اور سماج کو سائنسی انداز سے پرکھنے اور سمجھنے کا قارئین کو ذوق عطا کیا۔ اپنی کتاب ''۲۰ ویں صدی میں اردو ناول'' میں ڈاکٹر یوسف سرمست نے رسوا کے فن کی دوسری جہات کا تذکرہ کیا ہے، ناول اُمراؤ جان ادا کے متعلق بالکل صحیح لکھا ہے:

> ''اس ناول میں انسانی زندگی کی تاریخ اور رومانی پہلو کا ایسا نپا تلا امتزاج ہے جو کسی بھی دوسرے ناولوں میں نظر نہیں آتا۔''(۱)

مذکورہ فن کاروں سے ہٹ کر ہمیں سرسید احمد خان، شبلی نعمانی اور مولوی ذکاءاللہ کی اصلاحی تحریکوں کو بھی نگاہ میں رکھنا چاہیے جہاں اصلاح کی روحانی روح کا احیا بحوالہ فرسودہ روایات سے بغاوت، سماج کو بدلنے کے لیے نیا جذبہ اور عزم اور ذہنی زبوں حالی سے چھٹکارا پانے کے لیے زندگی کے نئے منشور کا وضع کیا جانا، سب کچھ ازبس ضروری تھا۔ واضح رہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے عشروں انگریز کی مکمل عمل داری قائم ہو چکی تھی اور نیاز کا تخلیقی وفکری خمیر اسی تاریخی، سماجی، معاشرتی اور ادبی پس منظر سے اُٹھا تھا۔

نیاز نے ۱۹۱۳ء میں ''ایک شاعر کا انجام'' نامی ناولٹ لکھا جو کہ ظاہر ہے کہ اس وقت کی رومان پسندی کی پیداوار ہے جس میں کرداروں کو ہیجان میں گرفتار دکھانا ماجرے کا لازمی جزو تھا۔ اس ہیجان میں انسانی عمل کے لیے عقلی جواز تلاش کرنا بے سود تھا۔ بعید از حقیقت واقعات جن میں تحیر موجود ہو اور فراریت تک لے جاتا ہو ازبس ضروری تھا، یعنی ایک قسم کا لایعنی مہم جوئی تھی جو انشائے لطیف کے ذریعے متشکل ہو رہی تھی۔ اس میں ماحول سے بے زاری کا عنصر بھی تھا اور جس کے دامن کو نچوڑ کر وضو کرنے کی خواہش کا عمل دخل بھی۔

''ایک شاعر کا انجام'' انہی کیفیات کا غماز ہے۔ افضال جو ایک خود شکل شاعر ہے اپنی تصوراتی دنیا میں مست ہے۔ وہ حمیدہ سے محروم ہو کر کہیں غائب ہو جاتا ہے۔ ناولٹ کا 'میں' خود مصنف یعنی نیاز ہیں جو اس کو مایوسی کی دلدل سے نکال کر کامیاب زندگی کی طرف موڑنا چاہتے ہیں۔ اس عرصے میں ایک بیرسٹر مولوی مظفر کی لڑکی رقیہ سے اس کی زبردستی شادی کرادی جاتی ہے، اتفاق سے رقیہ بخار میں مبتلا ہو کر مر گئی اور افضال جنون کی کیفیت میں گھر گیا۔ اسی دوران پتا چلا کہ حمیدہ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ خبر اخبار میں چھپی تھی۔ لیکن چند دنوں بعد حمیدہ اس کی زندگی میں واپس آ گئی۔ یہ سچوایشن نیاز نے غالباً تحیر کے ساتھ ساتھ نقطۂ عروج کے لیے تخلیق کی۔ افضال کی بدقسمتی کہ ایک دن حمیدہ بھی خون تھوکتی ہوئی اس دنیا سے گزر گئی اور افضال ایک ایسے جنون میں گرفتار ہوا جو اس کی زندگی تھا۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ اسے دیوانگی ہی کی کیفیت میں زندہ رہنے دیا جائے۔ ہوش میں آنے سے وہ موت سے ہمکنار ہو جائے گا۔ یہاں نیاز نے قاری کو ذہنی جھٹکا دیا ہے کہ دیوانگی زندگی کی علامت ہے۔

میڈیکل سائنس میں اس کی توجیہہ موجود ہو کر نہیں لیکن رومانی توجیہہ موجود ہے۔ گویا فنتاسی Fantasy کی ایک دنیا ہے جہاں ناممکنات کو ممکنات تصور کیا جاتا ہے اور اس میں سے ایک غیر روایتی حقیقت اور اکثر ایسی اخلاقی تصوّر برآمد کیا جاتا ہے جسے ماننے بنا چارہ نہیں ہوتا۔ اس ناولٹ کے مختصر سے ماجرے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ فراریت اور رومانس کے پیٹرن میں عشق، شادی، ناکامی ہجر اور وصال کا چلن عام ہے جو کہ غزل کا موضوع ہے، اسی لیے نیاز نے اپنے زبان و بیان کے بارے میں ''گزارش'' کے تحت لکھا ہے:

> ''غالباً دوران مطالعہ نوائے ترکیب، لطافتِ بیان، پاکیزگیٔ تخئیلات آپ ہر جگہ پائیں گے اور یہ ہی میرا ذوقِ حدیث ہے۔ اگر جناب کی نگاہ میں یہ آشفتہ بیانی محمود سمجھی گئی تو میں اس کا دوسرا حصّہ بھی پیش کر سکوں گا۔'' (۴)

ظاہر ہے کہ دوسرے حصّے سے ان کی مراد ''شہاب کی سرگزشت'' ہے جو ۱۹۱۴ء میں وجود میں آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نیاز کی جمالیاتی رومانیت ''شہاب کی سرگزشت'' میں صحیح معنوں میں ظاہر ہوئی ہے اور اسی میں ان کا نقطہ نظر Point of View بھی واضح ہوتا ہے جو کہ معاشرے سے نظریاتی بغاوت اور افلاطونی محبت Platonic Love کے واضح اشارے ہیں جو شادی کے تصوّر سے علاحدہ ایک نظریہ ہے یعنی ''منزل کے مقابلے میں جستجو منزل میں زیادہ لطف ہے! اس کو یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ وصل کے بعد ہجر، کسک اور دیگر منزلیں متروک ہو جاتی ہیں۔'' شہاب کی سرگزشت میں اپنے نقطۂ نظر کی آبیاری کے لیے ماجرے کا پورا ڈھچر ہی تبدیل کر دیا۔ ان کا شہاب فلسفی قسم کا شخص ہے جس کے پاس شادی اور وصل کی مخالفت میں ڈھیروں دلائل ہیں۔ اتفاق سے نیاز کے یہاں نان فکشن موضوعات جو مذہبیات، بڑی ادبی شخصیات، نفسیات، جنسیات، فلسفہ، تاریخ، خرد افروزی، فقہی مسائل، عمرانیات، علم البشریات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں منطقی دلائل کا حسن ہے۔ یہ ہی کیفیت شہاب کے خیالات میں ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ شہاب کے لبادے میں نیاز ہی بول رہے ہیں، یوں شہاب نیاز صاحب ہی کا پروٹو ٹائپ Prototype ہے۔ شہاب شادی کا مخالف ہے اور

پرخلوص عشق ومحبت کا داعی ہے۔ وہ اپنے دوست محمود کو سکینہ سے شادی سے منع کرتا ہے:

تم مسئلہ محبت اور ازدواج کو دنیا کے اور مسائل میں کیوں
شامل کرتے ہو۔ کون کہتا ہے کہ حصول مدعا بری چیز ہے،
لیکن مسئلہ نکاح میں اور نکاح بھی وہ جو نتیجہ محبت قرار دیا
جائے، سب سے بڑی غلطی یہی ہے کہ ایک شخص مدعا اس
چیز کو قرار دیتا ہے جو حقیقتاً مدعا نہ ہونا چاہیے۔ اگر محبت کا
نتیجہ صرف نکاح ہونا چاہیے تو میں کہوں گا کہ آگ کا کام
بہالے جانا اور پانی کا کام جلادینا ہونا چاہیے۔'' (۳)

شہاب مزید کہتا ہے:

''میرے نزدیک محبت نام ہے ایک بے غرض انہماک کا،
ایک خود فراموش محویت کا، جو پیدا ہو، حسن کو دیکھ کر خواہ وہ
حسن ظاہری ہو یا باطنی، واضح ہو یا غیر واضح، زمین میں ہو
کہ آسمان میں۔'' (۴)

اس قسم کے خیالات بہت آگے تک جاتے ہیں۔ پھر اختر نامی رقاصہ میدان میں اتر آتی ہے جو اشاعت میں مدد دیتی ہے۔ اس عرصے میں محمود سکینہ سے شادی کر لیتا ہے اور شہاب کی بیماری کے دوران اس کے پاس بمبئی آجاتا ہے اور اختر رقاصہ سے شادی کا خواہش مند ہوتا ہے، اِدھر سکینہ کا خط آجاتا ہے کہ محمود اختر سے شادی کر لے، میں اسے بہن سمجھوں گی! یہاں نیاز ماجرے کو پلٹا دیتے ہیں اور یہ دکھاتے ہیں کہ شہاب نے کئی بچوں کی بیوہ ماں سے شادی کر لی تا کہ اسے ملے، اس کی تنہائی دور ہو اور اسے تحفظ ملے۔ یہاں نیاز نے ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''ایامیٰ'' کا اتباع کیا ہے جو عقد بیوگان کی تھیم Theme پر ہے۔ شہاب کی اس شادی کے سلسلے میں دلائل مندرجہ ذیل ہیں جن کا اظہار وہ اپنے اور محمود کے دوست طفیل سے کرتا ہے:

''آپ کو معلوم ہے کہ میں نے جس خاتون سے عقد کیا
ہے وہ ایک شریف خاندان کی فرد ہے، یعنی اپنی اصل اور

معاشرت کے لحاظ سے ان میں یہ اہلیت موجود ہے کہ تمدن
کو فائدہ پہنچا سکیں، لیکن فطرت جو انسان کا امتحان لینے
کے لیے بعض اوقات سخت سے سخت ظلم کرنے پر آمادہ
ہو جاتی ہے، ان کو بیوہ کردیا۔ اس حال میں کہ وہ اپنی
متعدد اولاد کی پرورش کرنے کے لیے وہ دنیا میں کسی سے
امداد کی توقع نہ رکھتی تھیں۔ یقیناً یہ آزمائش خاتون کی نہ تھی
بلکہ سوسائٹی اور اس کے افراد کی تھی جو سوسائٹی کی غفلت
سے تباہ ہو رہے تھے، اتفاق سے مجھے یہ حالات معلوم
ہوئے اور میں نے کوشش کی کہ کسی طرح اس خاندان کی
مدد کروں، بغیر اس کے کہ رشتہ ازدواج قائم ہو۔'' (۵)

اس اقتباس سے سے صاف ظاہر ہے کہ نیاز صاحب نے روایت سے بغاوت کا اشارہ دیتے ہوئے اس عملی رومانیت کو نبھایا ہے جس کے تحت پچھلے موقف سے فراریت لازمی تھی۔ پھر زندگی سے تائب ہو کر لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیتی ہے، یوں نیاز کے ماجرے کا رومانوی دائرہ مکمل ہو جاتا ہے۔

پروفیسر اے بی اشرف ان چند نقادوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے نیاز کی افسانہ نگاری بالخصوص کہانیوں پر قلم اٹھاتے ہوئے کتاب ''نیاز شناسی'' مطبوعہ ۱۹۹۷ء میں لکھا ہے کہ نیاز کو محض رومانی افسانہ نگار کہنا مناسب نہ ہوگا۔ ان کے یہاں معاشرتی اور اصلاحی پہلو بہت حد تک نمایاں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح پریم چند کے یہاں حقیقت میں مثالیت کا رنگ ملتا ہے، اسی طرح نیاز اور یلدرم کے یہاں بھی رومانیت میں حقیقت کا پہلو موجود ہے۔ (۶)

''ایک شاعر کا انجام'' اور ''شہاب کی سرگزشت'' جیسے ناولوں کے ہٹ کر نیاز نے پانچ مجموعے کہانیوں یعنی افسانوں کے دیئے ہیں جن کے عنوانات یہ ہیں: نقاب اٹھ جانے کے بعد، نگارستان، جمالستان، مختاراتِ نیاز اور حسن کی عیاریاں۔

''نقاب اٹھ جانے کے بعد'' مذہبی شخصیات کی منافقتوں اور ریاکاریوں کے بیان پر

مشتمل ہے۔ سب جانتے ہیں کہ نیاز کا یہ محبوب موضوع تھا۔ ''نگارستان''، ''جمالستان'' اور ''حسن کی عیاریاں'' عورت کے حسن، مردوں کے ان سے والہانہ عشق، عورت کی وفاداری، محبت میں شکست، انسانی ہمدردی، البتہ ''مختاراتِ نیاز'' تمام افسانے غیر ملکی کہانیوں سے جن کی بنا پر مشرق اور مغرب کے ماجروں کا کینوس مقامیت سے بین الاقوامیت تک جا پہنچتا ہے۔ اسلوب سب جگہ سادہ ہے۔ ترسیل کا کوئی مسئلہ نہیں اور سب ہی افسانے متاثر کن زبان ور دل پذیر استعاروں وتماثیل سے لدے پھندے ہیں جو ماجرے کے لحاظ سے اس وقت کے قارئین کا دل لبھانے کے لیے کافی تھے جو پہلی جنگِ عظیم کے ہندوستان پر سیاسی، معاشرتی، سماجی اور معاشی اثرات کے تلے ایک ایسی رومانی دنیا میں پناہ لیے ہوئے تھے جہاں خارجی اور داخلی فضائیں اتنی مہلک نظر نہیں آتی تھیں جتنی کہ نظر آنا چاہیے تھیں کیوں کہ ایک نوع کا رومانس انھیں سہارا دیے ہوئے تھا لیکن یہ سحر ترقی پسند تحریک نے توڑا جب نئی رومانیت غفلت کے پردے کو چاک کرتی ہیں۔ اس صورت حال کی لپیٹ میں مجنوں گورکھپوری کا فکشن بھی لپیٹ میں آجاتا ہے اور خالی مجنوں گورکھپوری ہی کیوں؟ قاضی عبدالغفار، حجاب امتیاز علی، عابد علی عابد، لطیف الدین احمد، آغا شاعر قزلباش کے علاوہ نذر سجاد حیدر، سلطان حیدر جوش، عظیم بیگ چغتائی، پطرس بخاری، ایم اسلم، پروفیسر محمد سعید، اوپندر ناتھ اشک اور کئی اور فن کار رومانیت کے رجحان کے تحت لکھ رہے تھے۔ یہ علاحدہ بات ہے کہ ان کے نقطۂ نظر میں خفیف سی تبدیلی بھی نظر آتی تھی۔

جہاں تک رومانی تحریک کا تعلق ہے اس حقیقت کا ادراک ضروری ہے کہ نیاز بقول ڈاکٹر انور سدید بحوالہ ''اردو ادب کی تحریکیں'' اپنے عہد میں بغاوت کی موثر آواز بن کر ابھرا اور اس نے ان قدروں کو شکستہ کرنے کی کوششیں کیں جنھیں برصغیر کا قدیم معاشرہ صدیوں سے حرزِ جاں بنائے ہوئے تھا۔ نیاز کی رومانیت کی خصوصیت تخیل اور صرف تخیل سے عبارت ہے۔ انھوں نے ادھر مجنوں گورکھپوری نے زندگی میں حزنیہ کیفیت سے اس لذت اور کرب کو رومانی جذبہ عطا کرنے کی کوشش کی جو جرات مندزندگی کا لازمہ ہے، ان کے یہاں ماضی کی بازیافت ایک قسم کی رومانی جست ہے جو بہر حال Present کے جال میں پھنسا دیتی ہے۔

اب چوں کہ ہر تحریک میں بہت آگے جاکر ایسی آوازیں بھی اُبھرتی ہیں جو اگلی تحریک کے لیے اسباب فراہم کرتی ہیں تو ایسی ہی ایک آواز میرزا ادیب کی تھی۔ انور سدید لکھتے ہیں ''میرزا ادیب رومانی تحریک کی آخری آواز ہے۔ انھوں نے رومانی تخیل کو داستان میں سمونے کی کوشش کی۔ میرزا ادیب کے ''صحرانورد کے خطوط'' ایسی داستانیں ہیں جن میں خیر و شر کی آویزش اور آزادی حاصل کرنے کی آرزو اساسی موضوعات ہیں۔ ان کی داستان نگاری میں صحرا ایک رومانی کردار کی صورت میں ابھرا ہے، اس میں ہیبت بھی ہے اور عظمت بھی۔(۸)

اس اعتبار سے رومانی تحریک خاص طور پر نیاز کے فکشن یا افسانہ نگاری کے اثرات اپنی جان دار شکل میں ترقی پسند تحریک میں پیوست ہوجاتے ہیں۔ یہ اس لیے بھی ممکن ہوا کہ روایت سے مکمل طور سے کٹ جانا ممکن نہیں، ایک میلان یا تحریک دوسرے میلان یا تحریک کو جنم دے سکتا ہے۔ نیاز کی اپنے دور تک پہنچی روایت سے بغاوت آنے والے دور میں ترقی پسند تحریک کی صورت میں وسعت پذیر ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں پیرس کانفرنس میں بورس پیترناک، ٹامسن مان، ای ایم فاسٹر اور بورس پیرناک جیسے قدآور ادیب شریک تھے جس میں ہندوستان سے سجاد ظہیر اور ملک راج آنند بھی موجود تھے۔ اگلے سال لکھنؤ میں جو پہلی ترقی پسند کانفرنس منعقد ہوئی، اس نے رومانیت کے منظرنامے ہی کو بدل دیا۔ پریم چند جیسے انقلابی، انسان دوست اور استحصال مخالف افسانہ نگار و ناول نویس نے یہ کہہ کر کہ ''ہمیں حسن کے معیار کو بدلنا ہوگا'' ایک نئی سج دھج اور شان تحریک کو عطا کردی۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل نے اسے ایک مشن Mission قرار دیتے ہوئے اپنی کتاب جدید ناول کا فن میں کہا:

> ''یہ چند مغرب زدہ لڑکوں کی شرارت نہ تھی بلکہ ملکی اور سماجی حالات ایسی اظہاریت کا دباؤ ادبی اور دانشورانہ صورتوں پر ڈال رہے تھے۔ ایک عام بے کاری، کساد بازاری اور زندگی میں بے یقینی کی کیفیت، ذہنوں کو منتشر کیے ہوئے تھی۔ دوسری طرف یورپ سے دمادم بے چینی اور جنگی تیاریوں کی خبریں سرگوشیوں میں ہر طرف پھیل رہی تھیں

اور ملک مصائب اور استحصال کے نیچے دبا ہوا کراہ رہا

تھا۔(۹)

ظاہر ہے کہ اس ماحول میں فن کار کے خیالات کا لاوا دوسری جانب مڑ گیا، عورت سے عشق کے ابھرے جذبات کا معاملہ ختم ہوا اور خانگی وخارجی مسائل میں گھری ہوئی عورت سامنے آئی۔ معاشی وسماجی مسائل مثلاً غربت، مفلسی، استحصال کی چکی میں پستا ہوا مرد نظر آیا جو گھر اور گھر سے باہر جوابدہ تھا اور اندرونی وبیرونی جبر نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا۔ پھر ماضی پرستی سے نجات کے نعرے لگے، فرد کے انفرادی مسائل سے اجتماعی مسائل کا تذکرہ ہونے لگا، رجعت پسندی کی مخالفت ہونے لگی اور معاشرے کو انقلابی لحاظ سے بدلنے کی خواہش کا اظہار ہوا۔ نیاز اگر فرسودہ روایات، ذہنی دیوالیہ پن اور تنگ نظری کے مخالفت تھے اور نئے زمانے کے قیام کے آرزومند تھے تو ترقی پسندوں میں بھی یہ ؟ جذبہ کارفرما تھا۔ نیاز کی کہانیوں اور ناولٹوں میں اگر طویل مکالمے ہیں تو ترقی پسندوں کے یہاں کفایت لفظی، سہل زبان، جدید استعارے، خوب صورت تمثیلیں، نئی علامتیں، نئے اسالیب اور تکنیکیں ماجرے کا حصہ بنیں جس کی ایک لہر سجاد ظہیر کے ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' (۱۹۳۸ء) سے چلی۔ نیاز قاری کے ذہن کو بدلنا چاہتے تھے، ترقی پسند ذہنی وسماجی انقلاب کے داعی تھے۔ ''لندن کی ایک رات'' سے چھ سال قبل ''انگارے'' (مطبوعہ ۱۹۳۲ء) کے افسانے ہنگامہ برپا کر چکے تھے جسے ظاہر ہے کہ اس وقت کا معاشرہ برداشت نہیں کر پایا تھا، اسی لیے اس پر پابندی لگی، مگر میدان میں پریم چند جیسا ہر قسم کے استحصال کا مخالف، انسانیت دوست، کہانی کار موجود تھا۔ ادھر احمد علی، عصمت چغتائی، عزیز احمد، احمد ندیم قاسمی اور کرشن چندر جیسے بڑے فن کار بھی ابھرے۔ کرشن چندر نے تو اپنی شاعرانہ بہالے جانے والی نثر سے نیاز کی یاد دلائی لیکن اپنی تخلیقی واسلوبیاتی افتادِ طبع کے زور پر نیاز سے آگے چلے گئے، اس کے بعد ممتاز مفتی، غلام عباس، اختر اورینوی، خواجہ احمد عباس، اختر حسین رائے پوری، منٹو، بیدی، ابوالفضل صدیقی، جوگندر پال، خدیجہ مستور، حاجرہ مسرور، آغا بابر، سید انور، بلونت سنگھ، محمد خالد اختر، ڈاکٹر سلیم خر، عبداللہ حسین، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، اقبال مجید، جیلہ ہاشمی، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں، نیر مسعود، سہیل

عظیم آبادی کے علاوہ چند اور فن کاروں نے اپنا ناقابل فراموش نقش اردو فکشن پر جمایا۔ ان نمایاں ناموں سے ہٹ کر ہماری نگاہ ۱۹۶۰ء کے جدید فن کاروں پر پڑتی ہے تو انتظار حسین جیسا فن کار ناسٹلجیا کا اسیر نظر آتا ہے۔ انھوں نے داستانی اسلوب میں بدھ جاتکوں، ہندو دیومالا یا اساطیریات، خودکلامی اور ڈائری کے مندرجات کو سمو کر نیاز کی یاد دلائی، جنھوں نے اپنے فکشن میں یونانی ضمیات سے خاصا استفادہ کیا تھا۔

قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانوں میں ایک خاص نوعیت کی دانشوریت، نئی سماجی آزادی، نئی فکر اور نئے جذبے کا شعور کی رو کے فنی، اسلوبیاتی اور تکنیکی اظہار کے تحت احساس دلایا اور ''آگ کا دریا'' میں ڈھائی ہزار سالہ تاریخی رومانس کو فکشن میں سمو کر تاریخیت کے حقیقی پیٹرن Pattern کو واضح کیا اور بتایا کہ ہر معاشرت میں مختلف قسم کے جبر آزمائے جاتے ہیں، اسی سے تاریخ بنتی ہے، تہذیب اپنا چولا بدل کر نئے منظرنامے کو جنم دیتی رہتی ہے۔ انسان زندہ رہتا ہے وہ وقت (Time) کے سحر سے آزاد نہیں ہوسکتا، نیز ہر قسم کے دکھوں کے باوجود علم اور گیان انسان کی مدد کر سکتے ہیں۔ یہاں فکر کی رو بہت زیادہ تیز ہے۔ منشا یاد، ڈاکٹر انور سدید، انیس ناگی اور ڈاکٹر رشید امجد اور دوسرے کئی فکشن نگار فکر کو فکشن میں سمو کر قاری کے ذہنی اُفق میں تازگی اور وسعت پیدا کرتے ہیں۔ انیس ناگی اپنے ناول ''دیوار کے پیچھے'' میں اپنے مایوس کردار سے کہلواتے ہیں ''میری نسل بیمار ہے، ترقی کے قدم رک گئے ہیں، نئی دانش کی ضرورت ہے۔'' ڈاکٹر انور سجاد کا مرکزی کردار وجودیت کے تحت کہتا ہے ''میں خواب میں جاگتا ہوں یا جاگتے میں خواب دیکھتا ہوں۔''

دراصل نیاز کے بعد ترقی پسند دور اور جدید دور دونوں میں حیات و ممات کے مسائل پیدا ہوگئے، زمینی حقائق ہی بدل گئے، سائنس اور ٹیکنالوجی نے عوام الناس کا مجموعی مزاج ہی بدل دیا، فکشن میں تقریباً بھی علوم سما گئے ہیں۔ عدم مفاہمت اور انتہاپسندی عروج پر ہے، اقدار کی شکست وریخت ہو رہی ہے۔ خیر و شر کے درمیان جنگ کے نئے پیمانے وجود میں آگئے ہیں، نئے نئے خیالات کا طوفان آیا ہوا ہے۔ وہی انتشار میں اضافہ ہوگیا ہے، نیاز کی آدرش پسندی کی جگہ حقیقت پسندانہ رومانیت نے لے لی ہے جو پڑھنے والے کے ذہن پر کچھ کے لگاتی رہتی

ہے۔ نیاز کے اثرات یقیناً مدھم پڑ گئے ہیں کہ ان کے بعد زیادہ تعداد میں قد آور ناول نگار اور افسانہ نویس اپنی کثیرالجہاتی تحریروں کے ساتھ ادب میں اپنے وجود کا اثبات کرا چکے ہیں۔ البتہ نیاز کی منفی اقدار کو شکستہ کرنے کی روایت آج بھی زندہ ہے۔ افلاطونی عشق ومحبت کی جگہ سفاک قسم کی حقیقت پسندانہ رومانیت کا رجحان آج کی ادبی پہچان ہے۔ یعنی نیاز کے یہاں جو فکری رومانیت چنگاری کی شکل میں موجود تھی وہ اب شعلہ بن چکی ہے جس کا ادراک آج کے فکشن کے نقاد اور محقق کو ہونا چاہیے۔

حوالہ جات

(۱) بیسویں صدی میں اردو ناول۔ نیشنل بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد دکن، انڈیا، مطبوعہ ۱۹۷۳، ص ۱۹

(۲) ایک شاعر کا انجام۔ نیاز فتح پوری۔ ادارۂ ادب العالیہ، نزد ڈاک خانہ گولیمار نمبر۲، کراچی ۱۸، مطبوعہ ۱۹۶۰ء، ص ۴

(۳) شہاب کی سرگزشت۔ ایضاً۔ نگار پاکستان، ۳۲ گارڈن مارکٹ، کراچی، مطبوعہ ۱۹۶۵ء، ص ۹

(۴) شہاب کی سرگزشت۔ ایضاً۔ نگار پاکستان، ۳۲ گارڈن مارکٹ، کراچی، مطبوعہ ۱۹۶۵ء، ص ۱۱

(۵) شہاب کی سرگزشت۔ ایضاً۔ نگار پاکستان، ۳۲ گارڈن مارکٹ، کراچی، مطبوعہ ۱۹۶۵ء، ص ۱۴۷

(۶) نیاز فتح پوری کی افسانہ نگاری مشمولہ نیاز شناسی (علامہ نیاز یادگاری خطبات)، حلقہ نیاز ونگار، کراچی، مطبوعہ ۱۹۹۷ء، ص ۳۵

(۷) رومانی تحریک۔ مشمولہ اردو ادب کی تحریکیں۔ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، مطبوعہ ۲۰۰۷ء، ص ۳۳۷

(۸) رومانی تحریک۔ مشمولہ اردو ادب کی تحریکیں۔ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، مطبوعہ ۲۰۰۷ء، ص ۳۳۰

(۹) جدید ناول کا فن (اردو ناول کے تناظر میں)۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل، نیا سفر پبلی کیشنز، الہ آباد (یوپی) انڈیا، مطبوعہ، ص ۱۱

نیاز فتح پوری کی افسانہ نگاری

(اسلوب کے حوالے سے)

پروفیسر ڈاکٹر ظفر عالم ظفری
گورنمنٹ کالج لیہ

پھر یوں ہوا کہ سر سید کی منطق، استدلال، گہری مقصدیت اور سنجیدگی کے بعد ایک شخص ایسی کہانیاں لکھنے لگا جسے پڑھنے والا آنکھیں جھپکتا نہیں، پہلو بدلتا نہیں، کتاب چھوڑتا نہیں، جگہ بدلتا نہیں اور صفحے پر صفحے پلٹتا ہوا حیرت و تحیر کے سمند، میں غوطے لگاتا آگے سے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

کہانیوں میں تھا کیا، جی ہاں وہ حسنِ فطرت جس کے سب طلب گار، وہ وادیء گل و لالہ جس میں سب بسنا چاہیں، وہ ستارے جن سے سب جھولی بھرنا چاہیں، وہ چاند جسے سب پکڑنا چاہیں، وہ کہکشاں جس پر سب چلنا چاہیں، وہ چشم غزال جس میں سب ڈوبنا چاہیں، وہ زلفِ عنبر جس کو سب مقدر بنانا چاہیں اور وہ صنفِ نازک جس کے جسم کی شعاعیں آفتابِ جہاں تاب کو منور کریں۔ یہ تھے نیاز فتح پوری، جنھوں نے ندرتِ فکر اور ندرتِ الفاظ کی ہم آہنگی سے اردو افسانے کی ایسی دنیا آباد کر دی جو ایک طویل عرصے تک اپنے پڑھنے والوں کو آسودگی فراہم کرتی رہے گی۔

نیاز نے کہانیاں لکھی ہیں مختصر مختصر، بعض لوگ کہتے ہیں یہ صرف تخیلاتی کہانیاں ہیں۔ ان میں زندگی کا نور نہیں، میں کہتا ہوں کہ یہ کہانیاں زندگی بھی ہیں اور حقیقی بھی۔ حیاتِ ارضی میں صرف کانٹے نہیں، دکھ نہیں، کرب نہیں، سسکیاں نہیں اس میں آسودگی ہے، لطف و سرور ہے، کیف و مستی ہے، حسن و جمال کا دل فریب اور سحر انگیز

انداز ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حسن و جمال اور اسلوب کا جو دل کش تصور نیاز فتح پوری نے اپنے افسانوں میں دیا ہے وہ قرآن پاک سے اخذ کیا ہوگا۔ سورہ رحمٰن کی آخری آیات میں کہا گیا ہے (مفہوم)

''اے لوگو! جنت وہ مقام ہے جہاں نازنینانِ سمن پر معصوم نگاہوں والیاں حجابِ نظر کے ساتھ آسودہ خرام، گل اندام، چشمِ گوہر بار، حسنِ سیرت اور حسنِ صورت سے مالا مال ہوں گی۔ گویا وہ یاقوت و مرجان ہیں کہ وادیءِ نوعِ بشر میں پروسنِ تخیل بھی ان کے حسنِ لافانی کو نہیں پا سکتا۔''

نیاز فتح پوری کو وصفِ خاص ان کا وہ جادوئی اور سحر انگیز اسلوب ہے جو انھیں کبھی مرنے نہیں دے گا۔ کوئی بھی شہ پارہ اُس وقت لافانی بن جاتا ہے جب لفظ اور معانی باہم شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ نیاز فتح پوری نے اردو ادب کو دو ناولٹ اور افسانوں کے پانچ مجموعے دیئے ہیں۔ ان کے ناولٹ ''ایک شاعر کا انجام'' اور ''شہاب کی سرگزشت'' ہیں جب کہ افسانوی مجموعوں میں ''نگارستان''، ''جمالستان''، ''نقاب اُٹھ جانے کے بعد''، ''حسن کی عیاریاں'' اور ''شبنمستان کا قطرہءِ گوہرین'' شامل ہیں۔

نیاز نے اپنے ناولٹ اور افسانوں کے لیے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ اردو ادب میں غالب اور خواجہ حسن نظامی کے علاوہ کہیں اور نظر نہیں آتا۔ غالب کے خطوط اور خواجہ حسن نظامی کی کتاب غدر دہلی کے افسانے اپنے اسلوب کی بنا پر ہی حیاتِ ابدی پا گئے ہیں۔ یہی کیفیت نیاز کے افسانوں میں ہے۔ ان کے ہاں تخیل کی فضا رنگِ بہار سے بڑھ کر رنگ دکھاتی ہے۔ وہ حیدر علی آتش کی طرح مرصع ساز ہیں۔ جدت طرازی ان کا شوق ہے۔ بندشِ الفاظ پر قادر ہیں، لفظوں کے جادوگر ہیں اور انشاء پردازی کے کمال جوہر دکھاتے ہیں۔ ان کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ بچے موتیوں کی لڑی ہیں یا صفحہءِ قرطاس پر بکھرے ہوئے یاقوت و مرجان۔ وہ شبنم کے قطرے ہیں یا ابرِ نیساں سے جھڑتے ہوئے قطرہءِ آب۔ وہ پھول کی پنکھڑی ہیں یا کسی مصور کے تراشے ہوئے ہونٹ، وہ کسی صانع کی سنواری ہوائی پلکیں ہیں یا کسی شاعر کی غزل۔ الغرض نیاز فتح پوری نے جس طرح کے تخیلاتی موضوع کا انتخاب کیا تھا اس کے اظہار کے لیے ایسے ہی حسین و بجل اور لطیف الفاظ کی ضرورت تھی۔

نیاز کا بنیادی موضوع تو چونکہ حسن، اُس کی دلفریبیاں، حسن کی رعنائیاں اور اس کی نزاکتیں، حسن کا ناز و ادا اور اس کی لطافتیں، اس کا خرامِ دلربا اور سحر انگیزیاں اور سب سے بڑھ کر اس کی توبہ شکن و ایمان شکن کافرادائیں ہے۔ حسن کے اس اظہار کے لیے الفاظ کے بخل سے کام چل ہی نہیں سکتا تھا۔ لہذا نیاز نے اسلوب کو باوقار اور زندہ بنانے میں اپنے قلم کی تمام تر جولانیاں صرف کر ڈالیں۔ بعض اوقات تو ایسے بھی محسوس ہونے لگتا ہے نیاز چھلکے پر فدا اور مغز سے بے نیاز ہوئے ہیں۔ لفظوں اور تخیل کے ذریعے سے ایسا ماحول پیدا کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا ایک طویل عرصے تک اُس سحر سے باہر نہیں نکل سکتا۔ ''ملکہ ء ناہید کی کہانی'' جو شبستان کا قطرہ ء گوہرین میں شامل ہے، اس میں حسن کا جو جلوہ دکھایا گیا ہے وہ چشمِ فلک کے تصور سے بھی باہر ہو گا۔

''جب بھی وہ صبح کو خانہ ء باغ کی روشوں پر ٹہلتی ہوتی اور آفتاب طلوع ہوتا تو یہ تمیز کرنا دشوار ہو جاتا کہ آیا آفتاب اس پر طلوع ہوا ہے یا یہ آفتاب پر۔ اور سورج کی کرنیں اس کے چہرے کو منور کر رہی ہیں یا اس کے جسم کی شعاعیں آفتاب کو''

نیاز فتح پوری سرسید کی مقصدی تحریک کے ردِ عمل کے طور پر سامنے آئے۔ ان کا تعلق رومانوی افسانہ نگاروں سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ موضوعات کے انتخاب کے ساتھ ساتھ انھوں نے لفظوں کے انتخاب میں بھی رومانوی اقدار کا پاس رکھا ہے۔ ڈاکٹر عقیلہ شاہین کہتی ہیں:

''رومانوی تحریک خالص فن کی تحریک ہے۔ وہ ادب برائے ادب کی علمبردار ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ادب کا موضوع صرف عشق و محبت، رومان، عورت اور حسنِ فطرت ہے۔ اس کا زندگی کی چیرہ دستیوں سے کیا کام۔ اس کا نصب العین صرف جمالیاتی حظ آفرینی اور مسرت و خوشی سے سرشار کرنا ہے۔''

نیاز کے افسانوں میں لفظوں کے انتخاب و استعمال کا جو سلیقہ نظر آتا ہے وہی ان کی پہچان اور زندگی ہے۔ ''دو گھنٹے جہنم میں'' ان کا ایک افسانہ ہے۔ جہنم بذاتِ خود ایک ایسا لفظ ہے جس میں سوائے دکھ اور کرب کے اور کچھ نہیں۔ لیکن نیاز فتح پوری نے مرزا غالب کی طرح الفاظ کے چناؤ اور استعمال سے زہر کو قند اور تلخی کو شیرینی سے بدل دیا ہے۔ بعض ناقدین نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ نیاز نے اپنے اس افسانے میں ایسا

خوب صورت اسلوب اختیار کیا ہے کہ وہاں جانے کی خواہش انگڑائی لینے لگتی ہے۔ نیاز فتح پوری چونکہ رومانوی افسانہ نگار ہیں اس لیے حسن کی دلفریبیوں اور اس کی جملہ رعنائیوں سے باہر نہیں نکلتے۔ تخیلاتی فضا میں ڈوبتے اور ابھرتے ہیں۔ ان کے ناولٹ ہوں یا افسانے وہ حسن کو کہیں بھی اور کبھی گہن زدہ اور شکست خوردہ دیکھنا نہیں چاہتے۔ انھیں جو لطف حسن کی جزئیات بیان کرنے میں آتا ہے وہ کہیں اور نہیں آتا۔ ''صدائے شکست'' ان کا ایک افسانہ ہے جس میں رجنا اور راج کمار دو کردار ہیں۔ راج کمار میں اظہار عشق کی قوت نہیں لیکن وہ من کے رجنا کی پوجا پاٹ کرتا ہے۔ گو کہ رجنا بیوہ ہے لیکن راج کمار کو اس سے کیا۔ وہ تو عاشق صادق ہے رجنا کا ہم جماعت ہے۔ دونوں موسیقی میں دلچسپی لیتے ہیں اور راج کمار تمام کالج کا بڑا اور پسندیدہ گانے والا ہے لیکن جب گائیکی کا مقابلہ ہوتا ہے تو راج کمار مقابلہ ہار کر رجنا کو جتوا دیتا ہے بعد میں رجنا کو ایک ڈاکٹر سے پتہ چلتا ہے کہ بے پناہ جذبہ محبت نے راج کمار کو ہارنے پر مجبور کیا۔ یہ جان کر رجنا سچے جذبہ عشق سے شکست کھا جاتی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راج کمار کی بن جاتی ہے۔ نیاز کا کہنا ہے کہ حسن کائنات کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اس کی قسمت میں شکست کھانا لکھا ہی نہیں۔ وہ ہمیشہ فتح یاب ہوتا ہے۔ لیکن ظالم اور سفاک معاشرہ حسن پر ہزار طرح کے قدغن لگاتا ہے۔ اسی لیے رومانوی افسانہ نگار اس دنیا کو پاپ کی بستی اور نفرت گہہ عالم کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ دنیا سے کنارہ کش ہو کر ماہتابیوں میں کھو جاتے ہیں۔ نیاز کا ناولٹ ''شہاب کی سرگزشت'' بھی اُن کے منفرد اور رومانوی تصورات کا علمبردار ہے۔ نیاز کا نظریہ حیات یہ نہیں کہ دنیا کیا ہے بلکہ یہ کہ دنیا کو کیسا ہونا چاہیے اسی لیے ان کے ناولٹ اور افسانے تصوراتی اور تخیلاتی ہیں۔ وہ دنیا کی مکدر فضا سے کہیں دور بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ نیاز کے تصور کے مطابق یہ دنیا ایک صحرا ہے اور راقم کے نزدیک ان کے افسانے، پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار۔۔۔ اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن۔ نیاز کا دل پسند موضوع تو صنف نازک اور اسکا حُسن پرسوز ہے لیکن کبھی کبھی وہ اس سے کنارہ کش ہو کر حوادثِ حیات اور آلامِ زمانہ کی طرف بھی لوٹ آتے ہیں اور دنیا کی وادی پرخار سے موضوعات کا انتخاب کرنے لگتے ہیں۔ ان کا اسلوب موضوع سے ہم آہنگ رہتا ہے۔ جہاں ان کا اشہب فکر تخیلات کی بے کنار

وادیوں میں بے لگام دوڑتا ہے وہاں ان کا اسلوب نہایت پر شکوہ اور دشت میں کھلے رنگا رنگ پھولوں کی طرح ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جب وہ تاریخی واقعات کو اپنا موضوع بناتے ہیں تو پھر ان کا اسلوب نہایت سیدھا سادا اور عام فہم ہو جاتا ہے۔ یہاں نہ جوش ہے نہ زور بیاں ورنہ وہ تو اس کے قائل ہیں "کہ زمین آسمان بن جائے جسن ستاروں میں ڈبکی لگائے چاند، ماتھے کا جھومر ہو تسنیم کوثر کا کنارہ ہو اور مسحور کن پازیب کی جھنکار دنیا کو جنت بنا دے"۔

رعنائی و جمال کے پر شکوہ قصیدے کہتے کہتے ان کے ناولٹ اور افسانوں میں تلخیٔ زمانہ بھی نظر آنے لگتی ہے۔ شیخ وملا پر انہوں نے کڑی طنز کی ہے۔ نیاز کے مخصوص خیالات سے بہت سے لوگوں کو اختلاف تھا جس کی بنا پر نئے انداز میں سوچنے اور اختلافی نقطہ نظر پر اردو ادب میں مقالے کا دروازہ کھلا۔ یہ کام کسی قدر سر سید نے بھی کیا لیکن بے باکی اور بے خوفی کے ساتھ نیاز نے اپنے خیالات کو ادب کا حصہ بنایا۔ بے باکی و بے خوفی اور اختلافی امور پر کھل کر اظہار کرنے کا جو انداز نیاز کے ہاں ملتا ہے وہ اردو ادب میں کہیں نہیں۔ آج اردو ادب میں جو اختلافی مباحث موجود ہیں اس کی بنیاد نیاز فتح پوری کے ہاتھوں ہی رکھی گئی۔

آخر میں یہ کہوں گا کہ نیاز فتح پوری نے لفظ اور معنی کا جو خوب صورت رشتہ قائم کیا وہ ہمیشہ انہیں زندہ رکھے گا۔ ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف نے لکھا:

"نیاز صاحب ایک ایسے اسلوب کے حامل ہیں جو ہر رنگ کے موضوع کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لیے موضوع کے ساتھ ساتھ ان کا اسلوب بھی بدل جاتا ہے۔ خالصتاً رومانوی رنگ کے افسانوں میں ان کا اسلوب رومانوی اور تخیلی ہو جاتا ہے۔ لیکن جن افسانوں میں اصلاحی اور حقیقی رنگ موجود ہے ان کا اسلوب سادہ اور حقیقی ہے"

•

ڈاکٹر انوار احمد

نیاز اور باب الاستفسار

آج، جب کہ ہمارے ذرائع ابلاغ یہ خبر عام کر چکے ہیں کہ ہم بحمد اللہ تاریخ سیاست، فلسفہ، سائنس اور اخلاق کی ہر گتھی سلجھا چکے ہیں اور درباری طوطے یہ کہانیاں سنا رہے ہیں کہ سوال کرنا مومن اور محب وطن کی شان کے منافی ہے تو ظاہر ہے اس بات پر تعجب ہی ہوگا کہ ہم میں ایک شخص ایسا بھی تھا جس نے چوالیس (۴۴) برس تک فلسفہ، شعر و ادب، سائنس، تاریخ، جغرافیہ، سیاست، سوانح علوم اجتماعیہ، ریاضی، ہیئت، لغت ار فنون لطیفہ سے متعلق چھ سو سے زائد سوالات کے جواب دیے، سوال گماں سے پھوٹتا ہے، مگر یقین اسے پروان چڑھاتا ہے، جواب دینے والے پر اعتماد ذوق گنہ اور بڑھاتا ہے اور یوں معرفت کی وہ شمع روشن ہوتی ہے، جس میں

سوال آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ

نیاز اپنی داستان حیات میں اپنے دو استادوں مولوی نور محمد اور مولانا محمد حسین خاں کوئی کا ذکر کرتے ہیں، جو نیاز کے سوالات سنتے ہیں قہر خداوندی ثابت ہوتے، مگر یہ علم و فن کی خوش قسمتی ہے کہ انہیں مولانا وزیر محمد خاں جیسے استاد بھی ملے، جو ان کی کج بحثی کا سامنا بھی خندہ پیشانی سے کرتے، میرے خیال میں یہ مولانا وزیر محمد خان کی محبت کا قرض تھا، جسے نیاز نے چوالیس برسوں میں چکانے کی کوشش کی ویسے بھی نگار محبت کی نشانی ہے نیاز نے علم کا یہ الاؤ ترک شاعرہ نگار بنت عثمان کی الفت میں روشن کیا۔[۱] نگار، کے چھ شماروں کے بعد ہی یعنی اگست ۱۹۲۲ء سے استفسارات کا سلسلہ شروع ہوا (ص ۷۲ تا ۷۵) جو مئی ۱۹۲۸ء سے باب استفسارات کے عنوان میں بدل گیا (ص ۸۴ تا ۸۴) اور عجیب اتفاق ہے کہ اپنی زندگی کے آخری دو جواب بھی

انھوں نے ۱۹۶۶ء کے مئی کے شمارے میں دیئے (ص ۷۵ تا ۷۹) اور یہ بھی انتہائی معنی خیز ہے کہ ان دونوں سوالوں کا نیاز کے دائرہ فکر سے براہ راست تعلق تھا' وہ خود کہتے ہیں۔ "میرے ذہنی انقلاب اور ادبی رجحانات کا تعلق زیادہ تر مولوی اور عورت ہی سے ہے۔" اس لیے وہ دونوں سے بے تعلق نہیں رہ سکتے' چنانچہ ان سے جو آخری دو سوال ہوئے تو ایک قرآن مجید میں مذکور نماز کے اوقات سے متعلق تھا تو دوسرا عشوہ و غمزہ و ادا کے نازک امتیاز کے بارے میں۔ نیاز پہلے سوال کے جواب میں قابل فہم جھلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ "میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آپ کو اس تحقیق کی ضرورت ہی کیا ہے' اگر آپ نماز کو اچھا سمجھتے ہیں' جیسا کہ آپ نے ظاہر کیا ہے پڑھیے' پانچ وقت نہ سہی' ایک ہی وقت سہی' پڑھیے تو (ص ۷۶)

جب کہ دوسرے سوال یعنی عشوہ و غمزہ و ادا کے نازک امتیاز کا جواب وہ بڑی دلجمعی سے دیتے ہیں۔

نیاز عموماً سوالوں کا جواب عالمانہ وقار اور تحمل سے دیتے ہیں' لیکن بعض سوالات کی نوعیت اور نیت ہی ایسی ہوتی ہے کہ جواب دینے والے کا اضطراب اور ارتعاش لطف دیتا ہے مثلاً جولائی ۱۹۳۶ء کے نگار میں حکیم عبدالحفیظ کے اس استفسار پر "کیا بعض حاجی صاحبان کی یہ روایت درست ہے کہ خانہ کعبہ کو آنکھ بھر کے دیکھنے سے بینائی جاتی رہتی ہے! نیاز کے ہونٹوں پر ایک قاتل قسم کی مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے اور کہتے ہیں۔

> "جو حاجی ایسا بیان کرتا ہے' وہ غالباً اندھا ہوگا اور اس نے اپنی بصارت زائل ہونے کے سبب یہ بیان کیا ہوگا' تاکہ اس میں اہمیت پیدا ہوجائے' ورنہ ظاہر ہے کہ کعبے کے دیکھنے سے بینائی میں کوئی فتور واقع نہیں ہوسکتا' اس سے تو بینائی اور بڑھنی چاہیے۔" (ص ۹۰)

اسی طرح اکتوبر ۱۹۳۶ء کے شمارے میں بمبئی میں شاید سمندر کے کنارے رہنے والے دو اصحاب الٰہی بخش اور عبدالغنی کا مشترکہ سوال شائع ہوا کہ "کیا پانی کو بھی فنا

ہے اور کیا آخر ایک روز یہ بھی خشک ہوجائے گا" ؟ تو نیاز جواباً ایک سوال ارسال کرتے ہیں "یہ پانی کے ساتھ آپ کو خاص لگاؤ ہے کہ اس کے فنا ہونے سے آپ کا جی دکھتا ہے اور اس کے معدوم ہوجانے پر آپ کو تعجب ہوتا ہے"؟ (ص ۸۷)

--- بعض سوال نیاز کے وسیع تر "انسانی ہمدردی" کے جذبات میں ہلچل پیدا کردیتے ہیں' جیسے اسی شمارے میں (اکتوبر ۱۹۲۶ء) بہاولپور کے خواجہ سید مبارک شاہ جیلانی نے کوئی تدبیر پوچھی کہ عشق و محبت کے مرض پر قابو پایا جاسکے' نیاز نے جو جواب دیا' اسکی تمہید ہی دلچسپ ہے "آپ کا استفسار جواب طلب تو نہ تھا' لیکن اس خیال سے کہ شاید آپ محبت میں مبتلا ہیں اور ایسے آدمی کا جی دکھانا اچھا معلوم نہیں ہوتا" (ص ۸۸)

اس کے بعد علاج بھی تجویز کرتے ہیں کہ "آپ کو اپنی خواجہ زادگی کی رعایت بہت منظور ہے' تو ہدف عشق کو بدل ڈالئے اور غور سے دیکھتے رہیے کہ پردہ سے نمودار ہونے والے ہاتھوں میں کس دست ارادت کی نرمی قابل توجہ ہے' توجہ کو ذرا طویل کردیجئے اور ریاکارانہ خشونتِ دور اندیشی کو کچھ کم۔" (ص ۸۸)

ستمبر ۱۹۳۲ء میں ایک سوال ازدواج بے ظلوت' کے عنوان سے شائع ہوا' جس میں بڑی معصومیت سے پوچھا گیا تھا کہ بدن کی بجائے روح پر ہی اکتفاء کرنے سے بیوی کی محبت حاصل کی جاسکتی؟ تو تین مرتبہ شادی شدہ کہلانے والے نیاز یوں جواب دیتے ہیں "میرے نزدیک شادی کا تعلق محبت سے ہوہی نہیں سکتا اور نہ محبت کے اصول پر رشتہ ازدواج قائم کرنا کوئی فعل مستحسن ہے (ص ۷۰) ...بیوی کو معشوقہ بناکر رکھنے میں کوئی حرج نہیں' لیکن اس کو معشوقہ سمجھنا سخت اصولی غلطی ہے" (ص ۷۲)

نیاز کے بعض جوابات ایسے ہیں' جن کی معنویت کو ہمارے عہد اور تجربے نے حد امکان تک بڑھا دیا ہے' مثال کے طور پر اپریل ۱۹۵۱ء میں ان سے سوال کیا گیا کہ اسلامی دنیا میں فوجی بینڈ کا رواج کب سے ہوا اور اس کا شرعی جواز کیا ہے ؟ نیاز کا جواب آج کے علامتی افسانے کا ایک بلیغ ٹکڑا محسوس ہوتا ہے' فرماتے ہیں "اسلامی حکومتوں میں نقارخانے کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور فوجی بینڈ کا اطلاق اسی پر ہوتا

ہے۔" (ص ۳۷)

جس بے باکی اور مصلحت سوزی سے نیاز اپنے نقطہ نظر کا اظہار کرتے ہیں، ممکن ہے آج ہم اسے قابل رشک نہ کہہ سکتے ہوں، تاہم تعجب کا اظہار تو کر سکتے ہیں مثلاً فروری ۱۹۳۹ء میں ان سے سوال کیا گیا کہ دنیا کا کون سا مذہب بہتر ہے؟ تو مولانا نیاز فتح پوری نے ارشاد کیا۔ "دنیا کے تمام مذاہب انسان کی ذہنی آزادی کو چھیننے کے لحاظ سے ایک سے ہیں اور ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی (ص ٦٨)

تاہم ایک وقت ایسا بھی نیاز پر آیا، جب انھوں نے مابعد الطبیعات سے متعلق سوالوں کا براہ راست جواب دینے سے گریز کیا، اگرچہ اس وقفے کی عمر زیادہ نہ تھی، تاہم یہ موڑ دلچسپی سے خالی نہیں، مئی ۱۹۴۲ء میں مذہب اور عقل کے تعلق کے مسئلے پر ایک سوال کا جواب یوں دیتے ہیں۔

> "میرے رائے یہ ہے کہ خاموشی اختیار کی جائے کیونکہ جس دور سے ہم گذر رہے ہیں، اس میں اس قسم کی لایعنی گفتگو کی گنجائش ہی نہیں۔ اس قسم کی باتیں اگر سنجیدگی سے کی جائیں تو جھگڑا پیدا کرتی ہیں اور اگر محض تفریحی مشغلہ ہو تو بے نتیجہ ہے۔" (ص ۳۴)

چنانچہ وقتاً فوقتاً ایسے کئی مہینے بلکہ سال آتے ہیں، جن میں باب الاستفسار عارضی طور بند دکھائی دیتا ہے، مگر نیاز ہر دستک پر بے قرار ہو اٹھتے ہیں۔ چنانچہ جون ۱۹۵۹ء میں ایک سوال پر بے اختیار ہو کر لکھتے ہیں۔

> "اس زمانے میں جب کوئی شخص اس قسم کی باتیں چھیڑ دیتا ہے، تو میں محسوس کرتا ہوں گویا بہت دنوں کا بچھڑا ہوا دوست مل گیا اور دل کھول کر اس سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔" (ص ۳۴)

پردے، تعلیم نسواں، اور آزادی نسواں، سے متعلق سوالوں کا جواب دیتے وقت

نیاز جذباتی دکھائی دیتے ہیں مگر اس کا سبب بھی تنگ نظری اور جہالت کی قوتوں کی جانب سے شاید مزاحمت ہے۔

جون ۱۹۳۴ء میں طبقہ نسواں کی تعلیم و تربیت' سے متعلق ایک سوال کا جواب یوں دیتے ہیں۔

"سب سے پہلے اپنی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کیجئے اور اپنی اصلاح کے درپے' ہو جیے کہ عالم نسواں میں خرابی کے تمام تر ذمہ دار مرد ہی ہیں۔"

اسی طرح جولائی ۱۹۳۶ء کے باب الاستفسار میں فرماتے ہیں :۔

"ہندوستان کی عورت ہنوز غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کیونکہ مسلمان مردوں کی ذہنیت کونسی ایسی بلند ہے کہ عورتوں کی پستی پر حیرت کی جائے۔" (ص ۲۸)

اگرچہ نیاز کے اپنے سات بچے تھے' تاہم یہ ان کی روشن خیالی کی ایک اور دلیل ہے کہ فروری ۱۹۳۵ء میں برتھ کنٹرول' سے متعلق ایک سوال کا جواب یوں دیتے ہیں۔

"ہندوستان کی سب سے بڑی لعنت یہی ہے کہ غریب و جاہل' بیمار و ضعیف بے عقل و معتوب افراد میں برابر اضافہ ہوتا جارہا ہے اور عسرت و افلاس اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ اس کا چارہ بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ فطرت پھر ان کو ہلاک کرڈالے' اس لیے اگر افزائشِ نسل صرف اس لیے چاہی جاتی ہے کہ ہم بار بار ان کی ہلاکت کا تماشہ دیکھتے رہیں' تو کیا اس سے زیادہ مناسب یہ نہیں ہے کہ ابتداء ہی سے ہم اس کی احتیاط کریں" (ص ۷۵)

کانگریس کے مقابلے پر مسلم لیگ کے سیاسی عزائم کے بارے میں نیاز اپنا ایک نقطہ نظر رکھتے تھے۔ مگر نومبر ۱۹۴۵ء میں کسی شخص نے نیاز کے نقطہ نظر سے آگہی کا

غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کی' مساجد اور سیاسی جلسوں' کے بارے میں اس پہلو سے سوال کیا کہ مولانا جواب میں مسلم لیگ کو مطعون کریں کہ وہ مساجد میں سیاسی جلسے کررہی تھی' مگر نیاز نے واضح طور پر جواب دیا۔ "مسلم لیگ کے جلسے مساجد میں منعقد کرنا کسی طرح روایات اسلامی کے منافی نہیں۔" (ص ۵۱) حالانکہ نومبر ۲۹ میں عبدالباقی کے سوال کے جواب میں نیاز ہندو مسلم اتحاد کے مسئلے پر کھل کر کہہ چکے تھے "اگر مسلمان اس کو اپنی توہین سمجھتے ہیں کہ وہ ہندی کہلائیں تو پھر غیر ملکیوں کے ساتھ ان کا بھی حشر ہونے والا ہے۔" (ص ۸۶)

اگر بدگمانی کو ایک لمحے کے لیے جگہ دی جائے اور یہ تصور کیا جائے کہ کہیں نیاز نے ایسا تو نہیں کیا کہ "ان کی طرف سے آپ لکھے خط "سوال" میں۔ تو اس بارے میں یہی وضاحت کافی ہوگی کہ "نگار" میں ہر سوال کرنے والے کا نام اور پتہ دیا جاتا تھا نومبر ۱۹۲۶ء کے شمارے میں نیاز نے لکھا ہے۔

> "حال ہی میں حکیم منزل بریلی سے کسی صاحب کا استفسار آیا ہے' جس میں بجائے نام کے ش' ت' ی' ا' ے' ا' م لکھا ہوا ہے' اس میں شک نہیں کہ استفارات اچھے ہیں اور اگر ان کا جواب دیا جائے تو لوگ بہت دلچسپی سے پڑھیں گے لیکن افسوس ہے کہ میں گمنام ہونے کی وجہ سے ان کو ضائع کرنے پر مجبور ہوتا ہوں' اگر وہ چاہتے ہیں کہ نگار میں جواب شائع ہو' تو براہ کرم اپنے نام سے مطلع فرمائیں' یہ راقم الحروف قسم کا تسمیہ مجھے پسند نہیں۔" (ص ۳' ۴)

اس باب میں نیاز سے ہر طرح کے سوال کیے جاتے مثلاً بچہ ماں کے پیٹ میں کیوں نہیں روتا (ستمبر ۲۲۔ ص ۷۸) کیا ایک بیوی سے بیسویں بچے کی پیدائش کے بعد تجدید نکاح ضروری ہے (فروری ۳۶' ص ۷۰) حضرت آدم کون سی زبان استعمال کرتے تھے؟ (اپریل ۲۳' ص ۳۱۶' ۳۱۷) مونٹ کارلو کے جواء خانے کی تفصیل بتایئے (جنوری [illegible] ۸۰) فری مشن یا فری میسن کیا ہے؟ (اگست ۲۵' ص ۸۶) اپریل فول کا آغاز کب ہوا (مئی ۳۰ ص ۸۹) نور محمدی اور پل صراط پر روشنی ڈالیے (اپریل ۳۵

ص ۷۳) قارون کی دولت کے بارے میں بتایئے (مئی ۱۹۲۸ء ص ۸۶) امریکہ کی دولت پر روشنی ڈالیے (مئی ۳۶، ص ۹۱) کیا خواب میں تصنیف و تالیف ممکن ہے؟ (ستمبر ۳۶ ص ۶۵) سرطان ملکہ چین، ہالہ اور مدوجزر پر روشنی ڈالیے (دسمبر ۲۵ء ص ۷۵ تا ۸۰) اس کے علاوہ ترکی، عربی، فارسی اور اردو زبان و ادب سے متعلق سوالات کی تو بھرمار ہی ہوتی، نیاز بلاشبہ حوالہ جاتی کتب سے مدد لیتے ہوں گے۔ مگر اول تو وہ پکی پکائی، کھیریا ڈاکٹر سلیم اختر کے الفاظ میں علم کے کیپسول کا زمانہ نہ تھا، دوسرے نیاز کا تجرعلمی مشکوک یا ادھورے جوابات کا قائل نہ تھا۔ چنانچہ وہ تجسس، تحقیق اور تدقیق میں لذت محسوس کرتے، تاہم کبھی کبھار بے کار سوالوں پر چڑ بھی جاتے، جیسے جولائی ۳۶ء میں لکھا "آپ نے یہ استفسارات کر کے گویا مجھ سے مطالبہ کیا ہے کہ دنیا کے سارے کام چھوڑ کر اپنی ساری عمر، ان مسائل کی تحقیق میں صرف کردوں اور پھر بھی نتیجہ میں سوائے دردسری کے اور کچھ حاصل نہ ہو۔" (ص ۸۹)

باب الاستفسا: کے حوالے سے نیاز کو معلم کہوں، تو ان معلموں کی حالت دیدنی ہوگی، جنھیں تدریس کے لیے صرف مثبت الفاظ کا کوٹہ فراہم ہوتا ہے، ایک عظیم جریدے کا مدیر کہوں، تو ان تمام مدیروں کے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی، جن کا اپنے ضخیم نمبروں سے وہی تعلق ہوتا ہے، جو کسی پلازا اور سیٹھ کا ہوتا ہے، تحریک کہوں، تو امن و اماں قائم رکھنے کے ذمہ دار متحرک ہوجائیں گے، مگر میں نیاز کے لیے مناسب القاب کی تلاش کا کام دانشوروں کے سپرد کرتا ہوں جنھیں ابھی یہ معلوم نہیں ہوا کہ ہمارے معاشرے میں صفات گھٹ رہی ہیں اور اسمائے صفات بڑھ رہے ہیں۔[۵]

حواشی

(۱) نگار، جولائی ۱۹۶۶ء ص ۳۰ تا ۳۳ (۲) ایضاً ص ۳۹ (۳) ایضاً ص ۳۷ سید عبدالکریم (مرزا پور) کا یہی سوال اور نیاز کا بعینہٖ یہی جواب مارچ ۱۹۶۰ء کے نگار (صفحات ۳۹، ۴۰) میں موجود ہے، قیاس ہے کہ مئی ۶۶ء کے شمارے میں اسے دوبارہ شائع کیا گیا۔ (انوار)

(۴) اس جواب کی اشاعت تک نیاز صاحب نے تیسری شادی نہیں کی تھی (انوار)

(۵) یہ مضمون نگار کے جشن طلائی منعقدہ ۱۹، ۲۰ جنوری ۱۹۸۳ء میں پڑھا گیا۔

ڈاکٹر نجیب جمال

مومن خاں مومن اور نیاز فتح پوری

اردو تنقید نگاری کی روایت میں نیاز فتح پوری کا نام ان لوگوں کے ساتھ لیا جاسکتا ہے جنھوں نے اپنے ایک جملے سے تنقید میں ایسے مباحث کو جنم دیا کہ موافقت اور مخالفت میں گریبانوں کے ڈھیر لگ گئے۔ اردو غزل کے بارے میں کلیم الدین احمد کا یہ جملہ کسے یاد نہیں کہ "غزل ایک نیم وحشی صنف سخن ہے۔" اس ایک جملے نے اردو غزل کی حمایت میں کتنی ہی کتابیں اور مضامین لکھوا دیئے۔ فراق کا یہ جملہ تو گویا اردو غزل کی ڈھال بن گیا کہ "غزل انتہاؤں کا سلسلہ ہے۔"

غالب کی تحسین میں عبدالرحمان بجنوری کے اس جملے نے بھی کس کس پہلو سے نہ بے چین کئے رکھا کہ "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ وید مقدس اور دیوان غالب۔" عبدالرحمان بجنوری نے یہ جملہ دیوان غالب جدید المعروف نسخہ حمیدیہ (مرتبہ مفتی محمد انوار الحق مطبوعہ مفید عام اسٹیم پریس آگرہ ۱۹۲۱ء) کے مقدمہ بہ عنوان "محاسن کلام غالب" کے آغاز میں تحریر کیا تھا۔ عبدالرحمان بجنوری کے اس جملے کا نفسیاتی ردعمل واضح طور پر سب سے پہلے یگانہ کے یہاں ظاہر ہوا جو ان دنوں اپنا مجموعہ کلام مرتب کر رہے تھے جسے انھوں نے "آیات وجدانی" کا عنوان دیا اور جب ۱۹۲۷ء میں "آیات وجدانی" شائع ہوئی تو اس میں شامل نثری تعلیقات گویا بجنوری کے اس ایک جملے کا جواب تھیں۔ مثال کے طور پر "آیات وجدانی" کے محاضرات کا یہ جملہ کہ : اگر ہندوستان کے مقدس صحیفے دو ہیں، ایک وید مقدس اور دوسرا غالب تو مرزا یاس کے "آیات وجدانی" کو تیسرا صحیفہ ماننا پڑے گا۔" یہی نہیں یگانہ نے ۱۹۲۵ء میں اٹاوہ سے جس ادبی رسالے کا اجراء کیا تھا اس کا نام بھی انھوں نے "صحیفہ" تجویز

کیا تھا اور اس میں "تقلید غالب" کے عنوان سے مضمون لکھ کر یگانہ نے مقلدین غالب اور شارحین غالب کی خوب خوب خبر لی تھی۔ عبداللطیف کی کتاب "GHALIB" مطبوعہ ۱۹۲۷ء کو بھی واضح طور پر بجنوری کے جملے ہی کا ردعمل قرار دیا جاسکتا ہے۔ یوں عبدالرحمان بجنوری کے ایک جملے نے غالب کی شاعری کو مبالغہ آمیز اثبات و انکار کی زد میں لا کھڑا کیا۔ مجموعی طور پر یہ دور غالب پرستی کا دور ثابت ہوا اور ان کی شاعری کی لو کچھ اس طرح بڑھائی گئی کہ دوسرے کئی چراغوں کی روشنی ماند پڑتی دکھائی دی۔ اسی فضا میں نیاز صاحب نے جنوری ۱۹۲۸ء میں نگار کا مومن نمبر شائع کر کے میر کے بعد مومن کے اردو غزل کے دوسرے بڑے شاعر ہونے کا اعلان کردیا۔ مومن نمبر میں پہلا ہی مضمون نیاز صاحب کا تھا اور اس مضمون کے پہلے ہی جملے میں مومن کے بارے میں دعوی کیا گیا تھا کہ :

> "اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعرائے متقدمین اور متاخرین کا کلام رکھ کر (بہ استثنائے میر) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہہ دوں گا کہ مجھے کلیات مومن دے دو اور باقی سب اٹھالے جاؤ۔"

میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ جملہ لکھتے وقت نیاز صاحب کے ذہن میں لازمی طور پر بجنوری کا مقدمہ اور اس کا پہلا جملہ تھا تاہم یہ ضرور ہے کہ غالب پرستی کے ہنگام میں وہ مومن کو نظرانداز ہوتا ہوا نہ دیکھ سکے اور انھوں نے شعوری طور پر مومن کو اس بے اعتنائی اور کم التفاتی کے حصار سے باہر نکالا جو ان کے گرد اول اول مولانا محمد حسین آزاد نے کھینچا تھا۔

نیاز صاحب کا یہی وہ جملہ تھا جو مومن کی از سر نو دریافت کا نقطہ آغاز ثابت ہوا۔ نگار کے مومن نمبر کو نہ صرف اس وقت بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ آج بھی اسے مومن کے سلسلے کی بنیادی دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نیاز صاحب کے دعوے کی حقیقت پر بھی کچھ غور کرلیا جائے۔ مگر اس سے پہلے مومن کے حوالے سے کچھ ضروری باتیں عرض کرنا چاہوں گا جو اخذ نتائج کے سلسلے

میں مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔

مومن کے بارے میں یہ بات حتمی طور پر درست ہے کہ وہ خالص تغزل کے شاعر ہیں۔ ہر صنف سخن کی کچھ اپنی خصوصیات اور اپنے تقاضے ہوتے ہیں جو اس صنف سخن سے خاص ہوتے ہیں۔ جو شاعر ان تقاضوں کو زیادہ سے زیادہ پورا کرتا ہے وہ اس صنف کی روح سے زیادہ سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ ولی ہماری غزل کی روایت کے وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے غزل کو بطور فن کے اختیار کیا اور اس کی خصوصیات کو متعین کیا۔ ان کے بعد میر نے گو فن کے تقاضوں کو پورا کیا تاہم ان کے یہاں غزل ایک ذریعۂ اظہار ہے۔ ہر وہ بات جو شاعری میں کہی جانی چاہیے میر نے اسے غزل کے پیرائے میں بیان کیا۔ یوں انھوں نے غزل کو پوری شاعری کا قائم مقام بنادیا۔ سودا اور درد نے بھی غزل کی منفی خصوصیات سے باہر نکل کر غزل کے موضوعات میں اضافہ کیا۔ درد نے تو مابعد الطبعیات اور فلسفہ اخلاق کو بھی غزل کا حصہ بنادیا۔ رفتہ رفتہ غزل کا دائرہ پھیلتا چلا گیا۔ آگے چل کر غالب نے فلسفیانہ تفکر کی گہرائی اور نفسیاتی تجزیے کا انداز اپنایا۔ ذوق نے غزل میں معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے نقوش اور کچھ اخلاقی باتوں کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ اسی دوران ایک دو شعراء نے غزل کو منفی حدود میں پابند کرنے کی کوشش کی مثلاً جرات نے اسے حسن و عشق کے معاملات تک محدود کیا لیکن غزل سطحی جذبات سے اوپر نہ اٹھ سکی اور اس میں کوئی بڑا جمالیاتی نقطہ نظر پیش نہ ہو سکا۔ لے دے کر مومن ہی ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے غزل کو صرف غزل کی حیثیت سے اپنایا اور اسے پوری اردو شاعری کا مترادف نہیں بنایا۔ مومن نے اپنی حیرت انگیز اشاریت اور غیر معمولی رمزیت سے تغزل کی سچی صناعی کو تخلیق کیا۔

مومن کے تغزل کا تجزیہ کیا جائے تو پہلی بات یہ معلوم ہوگی کہ انھوں نے اپنے آپ کو حسن و عشق کے موضوعات تک محدود رکھا۔ اس سے دو نتیجے ظاہر ہوئے، ایک تو یہ کہ فکر کا عنصر ان کی غزل سے خود بخود خارج ہوگیا' دوسرے یہ کہ زندگی کے دیگر تجربے بھی ان کے یہاں کم ہیں اس لئے مومن کے تغزل پر نیاز صاحب قلم

اٹھائیں یا مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی' ڈاکٹر عبادت علی بریلوی لکھیں یا انجم اعظمی ہم ان سے ہرگز یہ تقاضا نہیں کرتے کہ وہ حکیم مومن خاں مومن کو کسی حکیمانہ طرز فکر یا فلسفیانہ انداز کا شاعر قرار دیں۔ مومن غزل کے شاعر ہیں اور تغزل کو بہر صورت ملحوظ رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں فکری عناصر کے بجائے محاکات کا رنگ پیدا ہوا ہے۔ ان کے ہر شعر میں کوئی نہ کوئی واقعہ یا منظر ایسا دکھائی دیتا ہے جس کا تعلق حسن و عشق کے سلسلہ در سلسلہ واقعات سے ہے۔ گویا یہ صرف حسن و عشق کی دنیا ہے جہاں اہم کام محبت اور اہم موضوع حسن ہے۔ مومن کی غزل کو مے خانے تغزل کہنا چاہیے۔

مومن محبت کے موضوع کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ ان کے یہاں کیفیات حسن اور معاملات حسن سب کے سب جذبے اور واردات کی حیثیت سے زیادہ تخیل کے سانچے میں ڈھلے نظر آتے ہیں۔ اس لحاظ سے مومن کی شاعری کی فضا داستانوں کی اس فضا سے مشابہ ہے' حیرت جس کا لازمہ ہے۔ شاید مومن اردو کے واحد شاعر ہیں جن کا تخیل اتنا زرخیز ہے کہ ان کی ساری شاعری تخیل کی پیداوار معلوم ہوتی ہے۔ چند اشعار دیکھیے :

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

محو حیرت کو وصال و ہجر دونوں ایک ہیں
بلبل تصویر کو کب یاد آتی ہے بہار

دیتا ہوں اپنے لب کو بھی گل برگ سے مثال
بوسے جو خواب میں ترے رخسار کے لئے

جنت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے
جور اجل تفرقہ پرداز تو دیکھو

مومن کی شاعری اور فن پر اس سرسری تبصرے کے بعد اب دیکھتے ہیں کہ نیاز صاحب اپنے جملے کی لاج رکھنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے۔ نیاز صاحب نے جس

طرح مومن کی شاعری کی تاویلات پیش کی ہیں کہیں مومن ان میں گم تو نہیں ہو گئے یا پھر واقعی مومن کو از سر نو دریافت کر کے بقائے دوام کے بارے میں ان کے منصب جلیلہ کو بحال کر دیا گیا۔

میر کے بعد مومن کا کلام اس لحاظ سے تو یقیناً امتیاز رکھتا ہے کہ میر کی طرح مومن نے کامیاب ترین غزلیں تقریباً سب بحروں میں کہیں۔ یہ غزلیں ایسی ہیں کہ فن پر مومن کی گرفت پر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح ان میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطالب ادا ہوئے ہیں اور مومن کی اشاریت اور رمزیت نے مفہوم کو کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ نفسیات محبت کو اشاروں کنایوں میں بیان کرنا غزل کے فن کا تقاضا بھی ہے۔ مومن کے اس ہنر کو ان کے مطلعوں میں دیکھیے :

شب تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزہ غماز دیکھنا

ناوک انداز جدھر دیدہ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے کئی بے جاں ہوں گے

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا
میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

وصل کی شب شام سے میں سو گیا
جاگنا ہجراں کا بلا ہو گیا

رویا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح
اٹکا کہیں جو آپ کا بھی دل مری طرح

جو پہلے دن ہی سے دل کا کہا نہ کرتے ہم
تو اب یہ لوگوں کی باتیں سنا نہ کرتے ہم

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے
کہیں صحرا بھی گھر[۱] نہ ہو جائے

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے
اس کا نہ دیکھنا بھی نگہ التفات ہے

مومن کی بہت سی غزلوں کے مزید مطلعے یہاں پیش کئے جاسکتے ہیں تاہم ظاہر ہے کہ بحروں کا تنوع اور متغزلانہ شعری آہنگ مومن کو بڑا شاعر قرار دینے کے لئے کافی نہیں۔ . . .

اپنے مضمون میں نیاز صاحب نے مومن کے بارے میں اپنی پسندیدگی کو اصول فطرت کے عین مطابق قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک صاحب رائے کو اپنی رائے پر اعتماد ہونا چاہیے اور اسے سمجھ لینا چاہیے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے وہی صحیح ہے۔ نیاز صاحب نے یہ واضح کردیا ہے کہ اسی اصول کے مطابق انھوں نے مومن کے کلام پر نظر ڈالی ہے۔ نیاز صاحب کو مومن کی جو ادا سب سے پہلے بھائی اسے ان کے ہی لفظوں میں ملاحظہ کیجئے :

"پہلی چیز جو مومن کو اپنے عہد کے دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ ان کے کلام سے کسی جگہ خوئے گدایانہ کا اظہار نہیں ہوتا۔"

ظاہر ہے کہ یہ بات انھوں نے غالب اور ذوق کی قصیدہ گوئی کے تناظر میں کہی ہے۔ نیاز صاحب کے خیال میں مومن جانتے تھے کہ زوال سلطنت کے آخری مراحل میں مفلس و بے دست و پا بادشاہ کو "شہنشاہ عالم و عالمیان" کہنا زخموں پر نمک چھڑکنا تھا جو غالب و ذوق ہی سے ممکن تھا۔ مومن کی غیور و خوددار فطرت اس کی متحمل نہ ہوسکتی تھی۔ مزید برآں ملی حمیت کا جذبہ ان میں اس قدر موجود تھا کہ جہاد کے موضوع پر انھوں نے ایک مکمل مثنوی تحریر کی۔ تاہم یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ

کیا اس بنیاد پر کہ مومن ایک آزاد منش انسان تھے یا یہ کہ انھوں نے کبھی بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ لکھا اور نہ کسی امیر کو سراہا۔ ہم مومن و غالب یا مومن و ذوق کے فن کا موازنہ کرسکتے ہیں یا پھر موازنے کے لیے "چیز دیگر" کو زیر بحث لانا ہوگا۔ نیاز صاحب کو بھی شاید اس امر کا احساس تھا اس لئے انھوں نے معاصر شعراء سے مومن کا موازنہ کرتے ہوئے جس دوسری خصوصیت کو ان کی وجہ امتیاز قرار دیا ہے وہ مومن کا رنگ تغزل ہے۔ نیاز صاحب کے نزدیک اردو غزل میں تصوف یا عشق حقیقی کا رنگ بھی سراسر غیر متغزلانہ چیز ہے جس سے مومن کا کلام بالکل مبرا ہے۔ نیاز صاحب لکھتے ہیں :

> "تصوف کی حدود وہاں سے شروع ہوتی ہیں جہاں عقل کی پرواز ختم ہوجاتی ہے اور وہ فضا جو ماورائے سرحد عقل و شعور ہے اس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں ... اس لئے میرے نزدیک تغزل میں تصوف کو شامل کرلینا ایک غزل گو کا کمال نہیں بلکہ اس کا عجز ہے۔ مومن نے اسی دنیا کا عشق کیا اور اس میں جتنے تجربات تلخ و شیریں ہوسکتے ہیں وہ سب انھوں نے حاصل کیے۔ وہی ہجر و وصال کی مادی کیفیات، وہی شکوہ شکایات، وہی رقیب کا کھٹکا، وہی التجائیں، وہی تدبیریں الغرض تمام وہ جذبات جو عناصر محبت سے تعلق رکھتے ہیں، سب مومن کے یہاں پائے جاتے ہیں۔"

نیاز صاحب کے اس بیان میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ مومن نے اسی دنیا کا عشق کیا۔ مومن کی غزلوں اور مثنویوں کے مطالعے سے جو چیز واضح طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ مومن ایک ہمہ وقتی عملی عاشق تھے۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے بھی وہ ہر لحہ محبت میں گرفتار ہونے پر آمادہ رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں محبت کی حقیقی واردات کا اظہار دوسرے کسی بھی غزل گو شاعر سے بڑھ کر ہے۔

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہوگئے ناچار جی سے ہم

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

جو پہلے دن ہی سے دل کا کہا نہ کرتے ہم
تو اب یہ لوگوں کی باتیں سنا نہ کرتے ہم
اگر نہ ہاتھ میں اس دلربا کے دل دیتے
تو دل پہ ہاتھ سدا دھر لیا نہ کرتے ہم
اگر نہ دام میں زلف سیہ کے آجاتے
تو یوں خراب و پریشاں رہا نہ کرتے ہم
اگر نہ دیکھتے وہ پیاری پیاری صورت آہ
تو ایک ایک کے منہ کو تکا نہ کرتے ہم

رویا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح
انکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح
نے تاب ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں
کم بخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح
ہوں جاں بلب بتان ستم گر کے ہاتھ سے
کیا سب جہاں میں جیتے ہیں مومن اسی طرح

اپنی آواز قدم سے بھی وہ ڈر کر رات کو
مڑ کے پیچھے دیکھ لیتا ہر قدم پر رات کو

دشمنی دیکھو کہ تا الفت نہ ہوجائے کہیں
لے لیا منہ پر دوپٹہ حال میرا دیکھ کر

اردو غزل میں معاملہ بندی کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے تاہم ایسا کم کم ہی دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی شاعر نے محبت کی حقیقی واردات کو شعر کے سانچے میں ڈھالا ہو۔ گویا غزل میں نفسیات محبت کا بیان حقائق سے زیادہ روایات پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض شعراء نے تو وہ کھیل کھیلا ہے کہ غزل کی لطیف جمالیاتی فضا بھی آلودہ

دکھائی دیتی ہے۔ ایک انحطاط پذیر معاشرے میں عشق کا ہوس بن جانا کچھ عجب بھی نہیں تھا۔ مومن کی محاکات نگاری نے بڑی پر لطف اور خوش کن کیفیات کو تصویر کیا۔ اگرچہ مومن کے کلام میں بھی جابجا کوچہ گردی کے نشانات کا سراغ لگایا جاتا ہے اور ان کی شاعری کا ذہنی رشتہ جرات کے ساتھ استوار کیا جاتا ہے۔ بلکہ نیاز صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "اگر مومن کے معشوق کا کریکٹر ان کے کلام سے متعین کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ بازاری جنس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔" تاہم یہاں انھوں نے مومن کو یہ رعایت دی ہے کہ "مومن کا کمال شاعری دیکھئے کہ اگر ایک طرف وہ پستی سے اس قدر قریب ہے کہ ادنی سی لغزش بھی اسے گرا کر جرات و انشا کی صف میں ملا سکتی ہے تو دوسری طرف بلندی کا یہ عالم ہے کہ غالب کی انتہائی پرواز بھی اس فضا تک نہیں پہنچتی۔ لیکن یہ سب انہیں حدود کے اندر ہے جن کو حدود تغزل کہا جاتا ہے۔"

جہاں تک محبوب کے جنس بازاری ہونے کا تعلق ہے تو امر واقعہ یہ ہے کہ یہ بات تو میر، مصحفی، انشاء، جرات، آتش، ناسخ اور غالب اور مومن سب کے حوالے سے درست قرار پا سکتی ہے۔ مومن کے یہاں بھی محبوب شاہد بازاری ہی ہے تاہم وہ خود داغ کی طرح بالا خانے میں ہر دلعزیز نہیں تھے۔ محبوب انہیں کس کس طرح آزماتا ہے، اس کا اندازہ مومن کے اس شعر سے بخوبی ہوتا ہے۔

لے شب وصل غیر بھی کاٹی
تو مجھے آزمائے گا کب تک

البتہ نیاز صاحب نے یہاں مومن و جرات کی غزل کے ایک بنیادی فرق کو بڑی خوبی سے نمایاں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"مومن نے نہایت عریاں طور پر معاملات حسن و عشق کا اظہار کیا ہے لیکن اسی کے ساتھ کسی جگہ فن مجروح ہوا اور نہ دنائیت پیدا ہوئی۔ مومن کا محبوب بھی جرات و انشاء کی طرح بازاری ہی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ جرات و انشاء کا عشق بھی بازاری

ہے اور مومن بہت بلندی سے دیکھتے ہیں اور بلند فضا تک محبوب کو بھی لے جانا چاہتے ہیں۔ جرات و انشاء اگر اپنی تمنا میں کامیاب نہیں ہوتے تو وہ ترک محبت کے لئے بھی آمادہ ہو جاتے ہیں لیکن مومن کی پاکیزگی ذوق کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی امید کو بھی اسی عالم آب و گل سے جدا قرار دے کر ایک غیرفانی چیز بنا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی محبت کی فضا محبوب و جلوۂ محبوب سے بھی بے نیاز ہو جاتی ہے۔"

نیاز صاحب نے سند کے طور پر مومن کے یہ اشعار بھی درج کیے ہیں :

قطع امید سے سر کاٹنے کو کیا نسبت
مجھ میں وہ دم ہے ابھی جو ترے خنجر میں نہیں

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خواب ناز میں
ہم نہیں چاہتے کی اپنی شب دراز میں

جانے دے چارہ گر شب ہجراں میں مت بلا
وہ کیوں شریک ہو مرے حال تباہ میں

نیاز صاحب نے یہاں مومن کے حوالے سے بڑی بنیادی بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"میرے خیال میں مومن ہی ایک ایسا شاعر ہے جو نفسیاتی رموز کو سمجھ کر شاعری کرتا ہے اور ایسی معنوی نزاکتیں پیدا کرتا ہے کہ غور سے تجزیہ کرنے کے بعد ان کا پتہ چلتا ہے۔"

اپنی بات کو دلیل سے واضح کرنے کے لیے انھوں نے مومن کے اس شعر کی مثال دی ہے۔

دن رات فکر جور میں یوں رنج اٹھانا کب تلک
میں بھی ذرا آرام لوں تم بھی ذرا آرام لو

یعنی فطرت انسانی ہے کہ جب کسی کے فائدے کی بات بتائی جاتی ہے تو گمان کی

بنا پر مشورہ قبول نہیں کیا جاتا لیکن اگر مشورہ دینے والا واضح کردے کہ اس میں تھوڑا سا میرا بھی فائدہ ہے تو پھر غور و تامل کی گنجائش نکل آتی ہے۔ مومن کے یہاں ایسے نفسیاتی رموز اور معنوی نزاکتوں کی کمی نہیں۔ یہ سب باتیں غزل کی فضا سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس فضا کا سب بڑا وصف مومن کا حسن خیال اور ان کی فنی لطافتیں ہیں جن کی بدولت ان کے کلام میں اعلیٰ درجہ کے شعری محاسن پیدا ہوگئے ہیں اور یہ بات نیاز صاحب کے حق میں جاتی ہے کہ انھوں نے مومن کے بعض اشعار کی شرح غیر معمولی انداز میں کی ہے مثلاً مومن کا یہ شعر:

غیر کے ہمراہ وہ آتا ہے میں حیران ہوں
کس کے استقبال کو جی تن سے نکلا جائے ہے

نیاز صاحب لکھتے ہیں "یہاں مومن کی جان ہی اس منظر کو دیکھ کر نکلی جارہی ہے کہ جس کو وہ استقبال سے تعبیر کرتا ہے لیکن استقبال کس کا یہ خود اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔"

غیر یا رقیب یا عدو کا کردار مومن کی غزل کا مستقل کردار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کردار کے حوالے سے مومن نے معاملات کے بعض بڑے لطیف و نازک پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔ بقول نیاز صاحب "رقیب کا کردار ہر جگہ ایک نئی کیفیت کے ساتھ اور عشق کی پوری نیاز کمینوں کو لئے ہوئے ہے۔" تاہم نیاز صاحب کو احساس ہے کہ رقیب کے ذکر سے محبوب کی سیرت پر اچھی روشنی نہیں پڑتی اسی لئے وہ مومن کے دفاع میں لکھتے ہیں "اول تو مومن کے عہد میں اس قسم کے مضامین معیوب نہیں سمجھے جاتے تھے اور اگر ہوتے بھی تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر اس قسم کے مضامین کوئی شخص مومن کی طرح لکھ سکے تو کیوں کر ان کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔"

مومن کی ایک اور خصوصیت جس کی طرف نیاز صاحب نے بطور خاص متوجہ کیا ہے انہی کے لفظوں میں یہ ہے کہ "کہیں کہیں وہ ایسے مخفی لیکن نہایت پرکیف نشانات چھوڑ جاتا ہے کہ ہر شخص کی نگاہ وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔" مومن کی جس

خصوصیت کی طرف نیاز صاحب نے اشارہ کیا ہے یہ درحقیقت اسی حیرت انگیز اشاریت اور غیر معمولی رمزیت کی وجہ سے ہے جس کی پوری اردو شاعری میں کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ مومن کے یہاں اکثر اجزائے کلام محذوف (UNDER STOOD) ہوتے ہیں۔ محذوفات کلام کا تقاضا یہ ہے کہ بات کھول کر نہ کی جائے۔ مومن کے شعر میں جو رمزیت پیدا ہوگئی ہے اس کی وجہ سے ان کا شعر سیدھا دل پر اثر نہیں کرتا بلکہ اسے سمجھنے کے لئے غور و فکر کرنا پڑتا ہے۔ جونہی یہ سمجھ آجاتا ہے ذہن لذت معنی سے سرشار ہو جاتا ہے۔ یہ ان کا عیب بھی ہے اور خوبی بھی۔ عیب اس لئے کہ حد سے بڑھی ہوئی اشاریت کی وجہ سے مومن کے بعض اشعار ناقابل فہم چیستان بن گئے ہیں اسی لئے بعض لوگوں نے مومن کے کلام کو مہمل بھی کہا ہے تاہم جہاں جہاں وہ قابل فہم ہیں وہاں ان کا کوئی مقابل نہیں۔ اس معاملے میں تو غالب بھی ان سے پیچھے ہیں۔ دیکھئے :

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا
میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

محو حیرت کو وصال و ہجر دونوں ایک ہیں
بلبل تصویر کو کب یاد آتی ہے بہار

کیا گل کھلے گا دیکھئے ہے فصل گل تو دور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

رہی شب کی سی بے تابی تو ہر روز
چرائیں گے ہم آنکھیں پاسبان سے

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزہ غماز دیکھنا

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے
کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

آخری شعر میں بظاہر بعد از مرگ محبوب کی پشیمانی سے فائدہ نہ اٹھانے کا پچھتاوا دکھائی دیتا ہے مگر نیاز صاحب نے اس میں یہ اضافہ کیا ہے کہ محبوب کی پشیمانی کا منظر ایسا ہے کہ مجھ کو اس پر اپنی جان نثار کردینی چاہیے۔ مومن زندگی اس لئے نہیں چاہتا کہ وہ اس زندگی کا لطف اٹھائے بلکہ محض اس لئے کہ محبوب کی اس ادائے انفعال پر اس کو نثار کردے۔

اپنے مضمون کے اس تشریحی حصے میں نیاز صاحب نے مومن کے کچھ مزید محذوف اشعار کی مثالیں بھی دی ہیں جیسے یہ شعر

جیب درست لائق لطف و کرم نہیں
ناصح کی دوستی بھی عداوت سے کم نہیں

ناصح کا یہ کہنا کہ جیب و گریبان کی حالت درست کرلوں درحقیقت دوستی نہیں عداوت ہے کیوں کہ ایسا کرنے سے محبوب کے لطف و کرم سے محروم ہوجاؤں گا۔ "ناصح ایسا کہتا ہے" بالکل محذوف ہے۔ یا یہ شعر دیکھئے :

بے جرم پائمال عدو کو کیا کیا
مجھ کو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں

محبوب کو خیال ہے کہ مومن کو عدو کی بے جرم پامالی کا حال معلوم ہوگیا ہے اس لئے رک رک کر مل رہا ہے۔ مومن محبوب کی اس کیفیت کا اندازہ کرکے یہ خیال اس کے دل سے نکالتے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر میرے ساتھ یہ سلوک کیا گیا تو مجھے کوئی پرواہ نہ ہوگی۔ مومن کا ایک اور شعر ہے :

دکھاتے آئینہ ہو اور مجھ میں جان نہیں
کہو گے پھر بھی کہ میں تجھ سے بدگمان نہیں

اس شعر کا سمجھنا اس علم پر موقوف ہے کہ جب کسی کو سکتہ ہوجاتا ہے یا کسی کی موت کے متعلق پورا یقین کرنا ہوتا ہے تو اس کے چہرے کے قریب آئینہ لے جاتے ہیں کہ اگر ذرا بھی سانس ہوگی تو آئینہ پرنم ہوجائے گا۔

اس تمام تفصیل کے بعد نیاز صاحب اپنے اس دعوی میں صادق دکھائی دیتے ہیں کہ مومن کا یہ مخصوص انداز بیاں غالب کے یہاں کمتر اور دوسرے شعراء کے یہاں بالکل نہیں پایا جاتا۔ وہ کسی واقعہ کے بیان میں درمیانی کڑیوں کو چھوڑ جاتے ہیں اور انہیں ملانے کی خدمت ذہن سامع کے سپرد کردیتے ہیں۔

مومن کے متعلق نیاز صاحب کا ایک دعوی یہ بھی ہے کہ "مومن اسلوب ادا اور ندرت بیان کا بادشاہ ہے۔ وہ معمولی معمولی بات کا اظہار کرتا ہے تو بھی اس لطف کے ساتھ کہ اس میں جدت پیدا ہوجاتی ہے اور ذہن سامع بے اختیار اس سے لطف اٹھاتا ہے۔" نیاز صاحب نے مومن کے اس شعر کی مثال بھی دی ہے :

شب فراق میں بھی زندگی پہ مرتا ہوں
کہ گو خوشی نہیں ملنے کی پر ملال تو ہے

شب فراق کی انتہائی تکلیف سے مرجانا یا مرنے کی آرزو کرنا بالکل قدرتی خواہش ہے مگر مومن نے خوشی اور ملال کو ایک جیسی حالت قرار دے کر مفہوم کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ نیاز صاحب کا یہ کہنا بالکل بجا معلوم ہوتا ہے کہ "مومن کبھی کسی بات کو معمولی طریقہ پر ادا نہیں کرتے وہ اپنے مدعا کو ایک خاص پُرلطف پیچ سے ظاہر

کرتے ہیں۔ مثلاً انہیں یہ کہنا تھا کہ ناصح کی نصیحت بالکل بے اثر چیز ہے اس کو اس طرح بیاں کیا ہے :

بات ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں
کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے

مومن اپنے محبوب سے صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اغیار سے سرگوشیاں نہ کیا کیجئے۔ اس کو اس طرح ادا کرتے ہیں :

غیر سے سرگوشیاں کرلیجئے پھر ہم بھی کچھ
آرزو ہائے دل رشک آشنا کہنے کو ہیں

ایک اور شعر میں مدعا یہ کہنا ہے کہ تمہاری خودبینی جتنی بڑھی جاتی ہے۔اس سے میری وارفتگی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کے لیے مومن نے جو انداز بیاں اختیار کیا ہے' نیاز صاحب نے اسے "قیامت خیز" قرار دیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو :

خودبینی و بے خودی میں ہے فرق
میں تم سے زیادہ کم نما ہوں

آپ نے دیکھا کہ غالب کے مقابلے میں مومن کا رویہ مدافعانہ ہے۔ غالب کے یہاں محبوب سے حریفانہ موازنہ ملتا ہے ان کی نرگسیت محبوب کی نرگسیت سے ٹکرا جاتی ہے۔ مومن نے خودبینی و بے خودی میں فرق قائم رکھا ہے اور حسن محبوب کی جلوہ نمائی کے مقابل خود کو کم نما کہا ہے۔ رویے کا یہ فرق دو بڑے شاعروں کی افتاد طبع اور شاعرانہ نقطہ نظر کا فرق بھی ہے:

گریباں کے چاک کی وسعت کو ظاہر کرنا تھا اس لیے مومن نے یہ انداز بیان اختیار کیا۔

دست جنوں کے جائیے صدقے کہ چمن سے
پھیلائے پاؤں ہم نے گریباں کے چاک میں

یہاں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ مومن نے غزل کے اسالیب کے لیے ایک مثالی لہجہ منتخب کیا ہے۔ اس مثالی لب و لہجے میں سادگی بھی ہے اور خالص فنی پیچیدگی بھی۔